ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

جارحیت اور تشدد کا انجام

فرقہ پرستی، جارحیت اور تشدد کا کھلا رجحان، ملک کو زمین دوز اور دھماکہ خیز سرنگوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دینا ہے، جو بالآخر ملک کو لے ڈوبے گی، گاندھی جی اس حقیقت کو خوب سمجھتے تھے کہ فرقہ وارانہ منافرت، تشدد اور جارحیت پہلے ملک کی آبادی کے دو اہم عنصروں (ہندو و مسلم فرقوں) کے درمیان اپنا کام کرے گی، پھر یہی ذیلی مذہبی اختلافات، طبقات اور برادریوں کی صف آرائی اور نسلی، لسانی، صوبائی وعلاقائی تعصّبات کی شکل میں ظاہر ہوگی، اور جب یہ کام بھی ختم ہوجائے گا تو وہ آگ کی طرح (جب اس کو جلانے کے لیے ایندھن نہ ملے تو اپنے کو کھانے لگتی ہے) ملک کو اور امن پسند شہریوں کو اپنا لقمہ بنالے گی اور یہ ملک تباہ ہوکر رہ جائے گا۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

(ملک ومعاشرہ انتہائی خطرناک موڑ پر: ۱۴-۱۵)

مركز الإمام أبى الحسن الندوي

دارعرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

ظالم حکمراں - اعمالِ بد کا نتیجہ

مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

اس دنیا میں جو اچھے برے حالات آتے ہیں تو ان کے کچھ تو ظاہری اسباب ہوتے ہیں جن کو دنیا کی عام سمجھ رکھنے والے سمجھ لیتے ہیں، اور کچھ غیبی اور باطنی اسباب ہوتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے خود خداوند تعالیٰ کی طرف سے بیان فرمایا ہے کہ بندوں پر دنیا میں جو اچھے برے حالات ان کے حکمرانوں کی طرف سے آتے ہیں، وہ دراصل ان کے اعمال کے نتائج ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: میں بادشاہوں کا بادشاہ اور سب حاکموں کا حاکم ہوں، سب حکمرانوں کے قلوب میرے قبضہ میں ہیں، اور میرا یہ قانون و دستور ہے کہ جب بندوں کی عام زندگی اطاعت و فرمانبرداری کی ہوتی ہے تو میں ان کے حاکموں کے قلوب میں ان کے لیے رحمت و شفقت ڈال دیتا ہوں تو ان کا برتاؤ رحمت و شفقت کا ہوتا ہے، اور اگر ان کی زندگی نافرمانی و بدکرداری کی ہوتی ہے اور معصیت کا غلبہ ہوتا ہے تو میں ان کے حاکموں کے قلوب میں ان کے لیے غصہ اور تکلیفیں دینے کا جذبہ ڈال دیتا ہوں پھر وہ ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دیتے ہیں اور ستاتے ہیں، تو دراصل یہ میرا عذاب ہوتا ہے، تمہارے حکام صرف آلہ کار ہوتے ہیں، آخر میں فرمایا گیا ہے کہ جب حاکموں سے تم کو تکلیفیں پہنچیں تو ان کے لیے بددعائیں نہ کرو، ان کو نہ کوسو، اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا، مجھے یاد کرو، معصیتوں کی زندگی سے توبہ کر کے میری فرمانبرداری والی زندگی اختیار کرو، آہ و زاری کے ساتھ میری طرف رجوع ہو، اس طرح تم حاکموں کے مظالم سے نجات پاسکو گے۔

جب نادر شاہ نے دلّی کو تاراج کیا اور دلّی والوں پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹے تو اس وقت کے عارف حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ نے فرمایا تھا:

''شامت اعمال ما صورت نادر گرفت''

(معارف الحدیث: ۷/ ۲۴۷-۲۴۸)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو اور ہندی میں ایک ساتھ شائع ہونے والا

ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

مرکز الامام أبی الحسن الندوی دارعرفات تکیہ کلاں رائے بریلی (یوپی)

جلد: ۱۱ — جولائی ۲۰۱۹ء - شوال المکرّم ۱۴۴۰ھ — شمارہ: ۷

سرپرست: حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ (صدر، دارعرفات)

مجلس ادارت

بلال عبدالحی حسنی ندوی

مفتی راشد حسین ندوی

عبدالسبحان ناخدا ندوی

محمود حسن حسنی ندوی

محمد حسن ندوی

معاون ادارت

محمد نفیس خاں ندوی

محمد ارمغان بدایونی ندوی

مسلمان کی شان

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:

”الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ النَّاسُ مِنْ لِسَانِهِ وَ يَدِهِ.“

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

(حقیقی مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے لوگ محفوظ ہوں)

(سنن النسائی، کتاب الایمان، باب صفة المؤمن: ۵۰۱۲)

پرنٹر پبلشر محمد حسن ندوی نے ایس، اے، آفسٹ پرنٹرس، مسجد کے پیچھے، پھاٹک عبداللہ خاں، سبزی منڈی، اسٹیشن روڈ، رائے بریلی سے طبع کرا کر دفتر ”پیام عرفات“ مرکز الامام أبی الحسن الندوي، دارِعرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی سے شائع کیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

فی شمارہ: -/Rs.10 — E-Mail: markazulimam@gmail.com — سالانہ زرتعاون: -/Rs.100

Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi Samiti (Punjab National Bank) A/c No. 6127002100000339 (IFSC: PUNB0612700)

فہرس

جمہوریت خطرہ میں!(اداریہ)..........۳
..........بلال عبدالحی حسنی ندوی

حب الوطنی کا تقاضا..........۴
..........مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

اصحاب کہف-ایک مطالعہ..........۶
..........حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ

اسلامی طرز فکر کا فقدان..........۸
..........مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ

ایثار و مواسات کیا ہے؟..........۱۰
..........بلال عبدالحی حسنی ندوی

ایمان وعمل کا حقیقی معیار..........۱۳
..........عبدالسبحان ناخدا ندوی

عُشر کے چند مسائل..........۱۵
..........مفتی راشد حسین ندوی

منصب نبوت اور معاش نبوی ﷺ..........۱۷
..........محمد ارمغان بدایونی ندوی

مسلمانوں کا زوال اور اس کے اسباب..........۱۹
..........محمد نفیس خاں ندوی

سلام اے صاحب خلق عظیم!

نتیجۂ فکر:-جناب حفیظ جالندھری

سلام اے آمنہ کے لال، اے محبوب سبحانی
سلام اے فخر موجودات، فخر نوع انسانی

ترے آنے سے رونق آگئی گلزار ہستی میں
شریک حال قسمت ہوگیا پھر فضل ربانی

سلام اے صاحب خلق عظیم، انساں کو سکھلا دے
یہی اعمال پاکیزہ، یہی اشغال روحانی

تری صورت، تری سیرت، ترا نقشہ، ترا جلوہ
تبسم گفتگو، بندہ نوازی، خندہ پیشانی

زمانہ منتظر ہے اب نئی شیرازہ بندی کا
بہت کچھ ہوچکی اجزائے ہستی کی پریشانی

زمیں کا گوشہ گوشہ نور سے معمور ہوجائے
ترے پرتو سے مل جائے ہر اک ذرے کو تابانی

حفیظؔ بے نوا بھی ہے گدائے کوچۂ الفت
عقیدت کی جبیں تیری مروت سے ہے نورانی

ترا در ہو، مرا سر ہو، مرا دل ہو، ترا گھر ہو
تمنا مختصر سی ہے مگر تمہید طولانی

مدیر کے قلم سے

جمہوریت خطرہ میں!

بلال عبدالحی حسنی ندوی

اس وقت ملک جس طرح دہشت گردی کے غار میں ڈھکیلا جارہا ہے، اگر اس کی فکر نہ کی گئی اور ہر طرح کے طبقاتی نظام سے بلند ہو کر اس کو روکنے کی طاقتور کوشش نہ کی گئی تو دنیا کی کوئی طاقت ملک کو تباہی سے نہیں بچا سکتی، یہ ان لوگوں کی بڑی بھول ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ کسی کو تباہ کر کے پھر جو چاہیں گے کریں گے، یہ ملک ہمیشہ سے مختلف مذاہب اور تہذیبوں کا گلدستہ رہا ہے، ہر ایک کو ہمیشہ یہاں اپنے مذہب اور فکر پر عمل کرنے کی آزادی رہی ہے، مسلمانوں کے شاہی نظام میں بھی انہوں نے کبھی ہندوؤں یا دوسرے مذہب کے ماننے والوں پر کوئی زبردستی نہیں کی، بلکہ ان کو اپنے ملکی نظام میں بھی شریک کیا، تاریخ میں اس کی نہ جانے کتنی مثالیں موجود ہیں، آج جمہوریت کے نام پر جس طرح قانون اور جمہوریت کی دھجیاں بکھیری جارہی ہیں، وہ پورے ملک کے لیے خطرہ کی گھنٹی ہے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ فرماتے تھے کہ جب آگ کو کھانے کے لیے کچھ نہیں ملتا تو وہ اپنے آپ کو کھاتی ہے، ظلم و سفاکی کا جب مزاج بن جاتا ہے، تو ظلم کرنے والا اپنے گھر والوں پر ظلم کرتا ہے۔ اس وقت ملک کے طول وعرض میں مختلف مقامات پر ہجومی تشدد کے جو واقعات پیش آرہے ہیں، اس کے نتائج بہت خطرناک ہوسکتے ہیں، یہ آگ اگر بڑھتی گئی اور اس کو بجھانے کی فکر نہ کی گئی تو کوئی اس سے اپنے آپ کو بچا نہ سکے گا، اور پورا ملک اس آگ اور خانہ جنگی کا شکار ہو جائے گا۔

ہمارا ملک تین بنیادوں پر قائم ہے، سیکولرزم (Secularism) عدم تشدد (Non Violence) اور جمہوریت (Democracy) اور اس وقت یہ تینوں بنیادیں خطرہ میں ہیں، ملک کے بہی خواہوں اور سچی محبت رکھنے والوں کی اس وقت بڑی ذمہ داری ہے، ان کا تعلق کسی شعبۂ زندگی سے ہو، اس وقت اگر وہ آگے نہ آئے اور انہوں نے اپنی پوری طاقت نہ لگادی تو حالات ایسے ہوسکتے ہیں کہ شاید پھر ان کا سنبھالنا مشکل ہو جائے۔

سچی بات یہ ہے کہ یہ مٹھی بھر لوگ ہیں جو اپنے فائدہ کے لیے ملک کو نیلام کی منڈی پر چڑھا دینا چاہتے ہیں، اکثریت آج بھی ان لوگوں کی ہے جو دل میں انسانیت کا درد رکھتے ہیں، انسانوں سے محبت رکھتے ہیں، ایسے لوگوں کو آگے آنے کی ضرورت ہے، لوگوں کو پیغام دینے کی ضرورت ہے، اور ایسے خرد ماغوں کا ہاتھ پکڑ لینے کی ضرورت ہے جو ملک کو غلط رخ کی طرف لے جارہے ہیں۔ اس وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ خطرات کو سامنے لایا جائے، اور ان سے بچنے کی تدابیر اختیار کی جائیں، برائیوں کو دور کرنے کی کوششیں کی جائیں، اور کم از کم برائیوں کو برا کہا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ آج مسئلہ نہ ہندو کا ہے نہ مسلمان کا، نہ کسی اور اقلیت کا، مسئلہ سچی انسانیت کا ہے، ان حقیقت پسندانہ اصولوں کا ہے جن سے انسانیت کا بھرم قائم ہے، جن سے ایک طاقتور سماج سر اٹھا کر چلتا ہے، اور وہ سمجھتا ہے کہ اس کے پیچھے انسانیت کی طاقت ہے، جس میں نہ امیر و غریب کا فرق ہے، نہ کمزور اور طاقتور کا، اس کی انسانیت اس کے تحفظ کے لیے کافی ہے۔

ایک آزاد اور جمہوری ملک کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ وہاں کے باشندوں کو حقیقی آزادی حاصل ہو، ان کے ضمیر آزاد ہوں، من کی بات کہنے کا حق سب کو ہو، اور اجلے من کے ساتھ انسانیت کا درد لے کر ملک آگے بڑھے، قدرت نے اس ملک کو طرح طرح کے خزانوں سے مالا مال کیا ہے، اس کی سب سے بڑی دولت محبت ہے جو اس کے خمیر میں شامل ہے، انسانی ہمدردی ہے، جس کے واقعات ملک کی تاریخ کا سنہرا باب ہیں، اس تسلسل کو ہمیں ہر قیمت میں باقی رکھنا ہے، تاکہ یہ ملک اپنے بنیادی اصولوں سے ہٹنے نہ پائے، جس پر اس کو قائدین آزادی نے اور اس کی راہ میں خون کا آخری قطرہ بہانے والوں نے ڈالا تھا۔

حب الوطنی کا تقاضا

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

ملک اور اہل ملک کی توانائی کیوں ضائع کی جارہی ہے؟ ملک اور اہل ملک کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے، ملک کی تعمیر وترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ غیر ضروری ذہنی انتشار، بدگمانی اور خوف کی فضا ختم کی جائے، کوئی ملک اس طرح ترقی نہیں کرسکتا کہ اس کی آبادی کے مختلف عناصر میں اپنے مستقبل کے بارے میں شکوک وشبہات ہوں، اور اس سے بڑھ کر ملک کے لیے بدخواہی نہیں ہوسکتی کہ وہ توانائی جو ملک کی سالمیت، اس کی حفاظت اور تعمیر وترقی میں صرف ہونی چاہیے تھی، وہ شکوک وشبہات کو رفع کرنے میں یا شکوک و شبہات کی فضا میں زندگی گزارنے میں خرچ ہو، میں ایک قدم آگے بڑھا کر کہتا ہوں کہ اگر ہم اندیشہ میں مبتلا ہیں کہ ہماری آئندہ نسل ہماری طرح ان چیزوں کی معتقد اور ان پر یقین کرنے والی نہیں ہوگی جن پر ہم اعتقاد رکھتے ہیں، اور جو ہمارے لیے ضروری ہیں تو مسلمانوں کے اندر ایک تذبذب اور اندرونی انتشار کی وہ کیفیت پیدا ہوگی جو صرف مسلمانوں کے لیے مضر نہیں، ملک کے لیے بھی مضر ہے، یہ ہرگز دانش مندی کی بات نہیں ہے کہ جب ملک میں کوئی مصیبت نہیں آئی، کوئی سائیکلون نہیں ہے، کوئی ایمرجنسی کی کیفیت نہیں ہے، کوئی آسمان سے اولے یا گولے نہیں برس رہے ہیں، کسی نے اس لیے حملہ نہیں کیا ہے کہ آپ مسلمانوں کے پرسنل لا میں تبدیلی کرائیے، ورنہ ہم اس ملک پر قبضہ کرتے ہیں، پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ وقتاً فوقتاً یہ آواز بلند ہوتی رہتی ہے کہ مسلم پرسنل لا میں ترمیم کی جائے؟

ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کی وحدت کے لیے، سالمیت کے لیے اور مشترک وطنی شعور کے لیے ضروری ہے کہ ایک مشترک واحد عائلی قانون (*Uniform Civil Code*) نافذ ہو، تو میں ایک سیدھی سی بات پوچھتا ہوں، اسکول کا بچہ بھی اس کا جواب دے گا ہے کہ پہلی جنگ عظیم جو ہوئی تھی، وہ اصلاً وابتداءً برطانیہ اور جرمنی کے درمیان ہوئی تھی، جرمن اور انگریز دونوں نہ صرف یہ کہ کرسچین ہیں، بلکہ پروٹسٹنٹ بھی ہیں، اور ان کا عائلی قانون بالکل ایک ہے، یہ کوئی بھی شخص معلوم کرسکتا ہے کہ جہاں تک عیسائی قانون کا تعلق ہے ایک ہے، پھر یہ دونوں دشمنوں کی طرح کیوں لڑے؟ اگر یونیفارم سول کوڈ جنگ کو روک سکتا ہے اور نبرد آزمائی اور تصادم سے باز رکھ سکتا ہے تو اس کو وہاں روکنا چاہیے تھا، پھر دوسری جنگ عظیم کا بھی یہی حال تھا کہ کرسچین اور پروٹسٹنٹ جن کی تہذیب بھی، عائلی قانون بھی بلکہ معاشرت بھی ایک ہے، وہ اس طرح سے لڑے جیسے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوں، آپ عدالتوں میں جاکر دیکھ آیئے کہ جو مقدمے آتے ہیں، مسلمان مسلمان کے خلاف مدعی ہے، مسلمان مسلمان کا مدعی علیہ ہے، اور مسلمان مسلمان کی عزت کو خاک میں ملا دینا چاہتا ہے، اس کے گھر پر ہل چلا دینا چاہتا ہے، ان دونوں کا عائلی قانون بھی ایک ہے، بعض اوقات تو خون بھی ایک ہوتا ہے، دونوں فریق ایک نسل، ایک خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، درحقیقت اختلافات اور دشمنیوں کا تعلق نفسانیت سے، دولت پرستی کے جنون سے ہے، نفس پرستی اور مادیت سے ہے، اس غلط نظام اور نصاب تعلیم سے ہے، جس نے اخلاقیات کو یکسر نظر انداز کردیا ہے، اس کا تعلق ہرگز عائلی قانون کے اختلاف سے نہیں ہے، یہ میں ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں اور چیلنج کرتا ہوں کہ عائلی قانون ایک ہوجانے سے اخلاقی صورت حال میں قطعاً ایک ذرہ کا فرق بھی نہیں پڑے گا، پھر کیوں بار بار اس کا حوالہ دیا جاتا ہے کہ یونیفارم سول کوڈ ہونا چاہیے، تاکہ آپس میں اتحاد والفت پیدا ہو

جاننے والے جانتے ہیں کہ میرا اس گروہ اور خاندان سے تعلق ہے جس نے سب سے پہلے انگریزوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا، اور بیش از بیش حصہ لیا، کلکتہ کی یہ سرزمین خاص طور سے اس کی شہادت دیتی ہے کہ وہ ایمانی قافلہ حجاز جاتے ہوئے یہیں سے گذرا تھا، اسی خلیج بنگال سے روانہ ہوا تھا، اور اپنے مستقر سے یہاں تک ایمان، توحید وسنت اور دینی حمیت کی روشنی پھیلاتا ہوا آیا تھا، اسی نے سارے ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف جہاد کی روح پھونک دی، قرآن کہتا ہے کہ تمہیں عصبیت اور بغض اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف کا دامن ہاتھ سے جانے دو، اور تعصب وحق پوشی سے کام لو:

﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ

أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى﴾ (المائدۃ: ۸) (اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو، انصاف کیا کرو کہ یہی پرہیزگاری کی بات ہے)

انگریز اس بارہ میں زیادہ حقیقت پسند تے، انہوں نے جب ہندوستان میں حاکمانہ طریقہ پر قدم رکھا تو انہوں نے اچھی طرح یہ سمجھ لیا کہ مسلمانوں اور ہندؤں کے عائلی قانون میں دخل نہیں دینا چاہیے، ان کو اس میں آزاد رکھنا چاہیے، اسی کے نتیجہ میں ہندوستان میں محمڈن لا کا اتنا بڑا کام ہوا، اسی کلکتہ کی سرزمین پر اور خاص طور پر یادش بخیر رائٹ آنریبل جسٹس سید امیر علی کے ہاتھوں اور سر عبدالرحیم وغیرہ کے ذریعہ ہوا، انگریزوں نے دو کام بڑی عقل مندی کے کیے، انہوں نے اس بات کو پالیا کہ بے ضرورت جذبات کو مجروح نہیں کرنا چاہیے اور مشکلات نہیں پیدا کرنے چاہئیں، یہ ایک ایسی قوم کا طرز عمل ہوتا ہے جو حکمرانی کا تجربہ رکھتی ہے، انہوں نے دو باتیں طے کیں، ایک تو یہ کہ عائلی قانون اور مذہب میں مداخلت نہیں ہونی چاہیے، دوسری بات یہ کہ نظام تعلیم سیکولر ہونا چاہیے کہ بلی کتے کے قصے پڑھاؤ مگر کسی دوسرے مذہب کی تلقین نہ کرو، ہم نے انگلش پرائمر اور ریڈریں پڑھی تھیں، ان میں شروع سے اخیر تک یہ دیکھا کہ جنوں اور بھوتوں پریتوں تک کے قصے اور افسانے آئے، جانوروں کے قصے آئے، لیکن کہیں یونانی رومن دیومالا کی بات، کرسچین میتھالوجی کی بات نہیں آئی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک اطمینان کی کیفیت رہی، وہ بنیادی دوسری تھیں جن بنیادوں پر ہندوستان کے مسلمانوں نے اور دوسرے عناصر نے مل کر یہاں غلامی کے جوئے کو اپنے سر سے اتار پھینک دیا، اور جنگ آزادی لڑی، ان دونوں دانش مندانہ فیصلوں نے ان کی حکومت کی بقاء میں مدد کی، اور اس کی مدت کو دراز کیا، ورنہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، اپنے تاریخ کے مطالعہ کی روشنی میں کہتا ہوں کہ جو واقعہ ۱۸۵۷ء میں پیش آیا وہ ۱۸۵۷ء میں پیش آسکتا تھا، اور پیش آنا چاہیے تھا، اور انیسویں صدی کے بالکل اوائل میں پیش آجانا چاہیے تھا، یہ سو برس سے زائد جو انہوں نے یہاں اطمینان سے حکومت کی، اس میں ان کی دانش مندی کو دخل ہے کہ باشندگان ملک کی مذہبیات میں، ان کے عائلی قانون میں دخل نہ دو، ان کے نظام تعلیم میں دخل نہ دو، ان کو سیکولر طریقہ پر پڑھاؤ، اپنے مذہب کے مطابق یہ عقیدہ رکھیں، عمل کریں، میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مسلمان اگر مسلم پرسنل لا (شرعی عائلی قانون) میں تبدیلی قبول کرلیں گے تو آدھے مسلمان رہ جائیں گے، اور اس کے بعد خطرہ ہے کہ آدھے مسلمان بھی نہ رہیں، فلسفہ اخلاق، فلسفہ نفسیات اور فلسفہ مذاہب کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ مذہب کو اپنے مخصوص نظام معاشرت وتہذیب سے الگ نہیں کیا جاسکتا، دونوں کا ایسا فطری تعلق اور رابطہ ہے کہ معاشرت مذہب کے بغیر صحیح نہیں رہ سکتی، اور مذہب معاشرت کے بغیر مؤثر ومحفوظ نہیں رہ سکتا، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسجد میں آپ مسلمان ہیں (اور مسجد میں کتنی دیر مسلمان رہتا ہے، اپنے سارے شوق عبادت کے باوجود؟) اور گھر میں مسلمان نہیں، اپنے معاملات میں مسلمان نہیں، اس لیے ہم اس کی بالکل اجازت نہیں دے سکتے کہ ہمارے اوپر کوئی دوسرا نظام معاشرت، نظام تمدن، اور عائلی قانون مسلط کیا جائے، ہم اس کو دعوت ارتداد سمجھتے ہیں، اور ہم اس کا اس طرح مقابلہ کریں گے، جیسے دعوت ارتداد کا مقابلہ کیا جانا چاہیے، اور یہ ہمارا شہری، جمہوری اور دینی حق ہے، اور ہندوستان کا دستور اور جمہوری ملک کا آئین اور مفاد نہ صرف اس کی اجازت دیتا ہے، بلکہ اس کی ہمت افزائی کرتا ہے کہ جمہوریت کی بقا اپنے حقوق کے تحفظ اور اظہار خیال کی آزادی اور ہر فرقہ اور اقلیت کے سکون واطمینان میں مضمر ہے۔

ہندوستان جیسے عظیم ملک میں جو مختلف مذاہب، تہذیبوں، زبانوں اور معاشرتی وعائلی نظاموں کا صدیوں سے مرکز چلا آرہا ہے، اور جس نے اپنی طویل تاریخ کے تسلسل میں اس حقیقت کے نہ صرف اعتراف بلکہ احترام، اس خصوصیت کے نہ صرف باقی رہنے کی اجازت بلکہ اس کے تحفظ وترقی اور اس کے ساتھ بقائے باہم اور مشترک ملکی اور قومی مفادات میں سرگرم اشتراک وتعاون کا ثبوت دیا ہے، اور جس کے لیے نا مذہبی اور جمہوری طرز حکومت (بشرطیکہ وہ پوری غیر جانب داری اور ذہن وضمیر کی صفائی کے ساتھ ہو) سب سے زیادہ سہل العمل، بے خطر اور قابل قبول نظام ہوسکتا، یہی طرز فکر مناسب ہے، اور یہ نہ صرف کہنے والوں کی، اپنے اپنے ایمان وعقیدہ اور قلب ضمیر کی صحیح ترجمانی ہے، بلکہ حقیقت پسندی، سچی حب الوطنی، اقوام وملل، تمدنوں و تہذیبوں، اور علوم وفلسفہ کے وسیع اور گہرے مطالعہ کا نچوڑ ہے۔

اصحاب کہف ایک مطالعہ

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی

أعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿وَكَذَٰلِكَ أَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوا أَنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَأَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيهَا إِذْ يَتَنَازَعُونَ بَيْنَهُمْ أَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوا عَلَيْهِم بُنْيَاناً رَّبُّهُمْ أَعْلَمُ بِهِمْ قَالَ الَّذِينَ غَلَبُوا عَلَىٰ أَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِم مَّسْجِداً﴾ (الکھف: ۲۱)

(اور اسی طرح ہم نے ان کی خبر کھول دی تا کہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت میں کوئی شبہ نہیں ہے، جب وہ اپنی بات میں آپس میں جھگڑنے لگے تو بولے کہ ان پر کوئی عمارت بنادو، ان کا رب ان کو بہتر جانتا ہے جو ان کے معاملہ میں غالب آئے، انھوں نے کہا کہ ہم تو ان کے پاس ایک مسجد بنائیں گے)

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لیے یہ بات واضح کردی کہ اصحاب کہف تین سو سال تک سوتے رہے، اور اس مدت میں نہ ان کا جسم سڑا، نہ ان کو کوئی تکلیف و پریشانی لاحق ہوئی، اس لیے کہ وہ زندہ تھے، اور سو رہے تھے، اور وہ اس ہیئت میں تھے کہ اگر کوئی آنے والا دیکھتا تو گھبرا کر بھاگتا، یہ سمجھ کر کہ یہ لوگ نہ جانے ہمارے ساتھ کیا کریں گے۔ اس واقعہ کی تفصیل میں جانے کا مقصد یہ بتایا گیا کہ تمام لوگ اچھی طرح جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا اور پکا ہے، اللہ نے جو کچھ کہہ دیا ہے کہ آخرت میں تمہارے عمل سے ایسا ہوگا تو اس میں کوئی شک باقی نہیں رہنا چاہیے، اس لیے کہ اس کی بات بالکل حق ہے، عربی زبان میں ''حق'' کہتے ہیں جو واقعہ کے مطابق ہو، گویا اس واقعہ کے بیان کرنے کے بعد لوگوں کو یہ یقین ہوجانا چاہیے کہ قیامت میں کوئی شبہ نہیں ہے، یعنی تمام انسانوں کو پختہ یقین ہوجانا چاہیے کہ ہمیں مرنے کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے، لہٰذا لوگوں کو اپنے اعمال کے ساتھ آخرت کے تصور پر بھی یقین جم جائے۔ آیت بالا میں یقین جمنے کے لیے ''لیعلموا'' (تا کہ وہ جان لیں) کا لفظ استعمال ہوا ہے، یعنی وہ اس بات پر یقین کرلیں، ظاہر ہے جس شخص نے بھی اصحاب کہف کا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا اس کو یقین آگیا ہوگا کہ جو اللہ یہ کرسکتا ہے، یعنی تین سو سال تک ان کو محفوظ رکھ سکتا ہے تو وہ سب کچھ کرسکتا ہے، لہٰذا اللہ آخرت کے متعلق جو کچھ کہہ رہا ہے، اس پر ہم کیسے شبہ کرسکتے ہیں۔

اصحاب کہف کو تین سو سال بعد بیدار ہونے پر طبعی موت آئی، چنانچہ جب ان کا انتقال ہوگیا تو وہاں کے لوگ آپس میں جھگڑنے لگے کہ ہمیں ان (اصحاب کہف) کے معاملہ میں کیا کرنا چاہیے، یہ لوگ بڑے بزرگ ہیں، کسی نے کہا کہ ہم یہاں مسجد بنادیں گے یا کوئی بڑا مزار بنادیں گے، کیونکہ لوگوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو تین سو سال تک سلایا اور زندہ رکھا تو ان سے عقیدت ہوگئی تھی، اسی لیے سب لوگ عقیدت کے مارے ٹوٹے پڑ رہے تھے، چونکہ اس وقت مسلمانوں کی خاصی تعداد ہوچکی تھی، اس لیے سب جوش عقیدت سے کہہ رہے تھے کہ ہم یہاں ایک عمارت یا مزار بنادیں گے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ زیادہ علم والا ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ کیا کرنا چاہیے، چنانچہ جو لوگ ان کے معاملہ میں غالب آگئے وہ حکومت کے لوگ ہوں یا وہاں کے چند سمجھدار لوگ ہوں، انہوں نے کہا: ان پر ہم عمارت نہیں بلکہ ایک مسجد یعنی عبادت گاہ بنادیں گے، یہ بات بہت ممکن ہے کہ وہاں عبادت گاہ بنائی بھی گئی ہو، اس لیے کہ وہاں کچھ ایسے آثار موجود ہیں، جن کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ اس جگہ کبھی کوئی مسجد تھی۔

﴿سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْماً بِالْغَيْبِ وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ قُل رَّبِّي أَعْلَمُ بِعِدَّتِهِم مَّا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا قَلِيلٌ فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ إِلَّا مِرَاء ظَاهِراً وَلَا تَسْتَفْتِ فِيهِم مِّنْهُمْ أَحَداً﴾

(الکھف: ۲۲)

(اب وہ کہیں گے کہ وہ تین تھے چوتھا ان کا کتا تھا اور (بعض) کہیں گے کہ وہ پانچ تھے چھٹا ان کا کتا تھا، (جیسے) بن دیکھے تیر چلانا اور بعض کہیں گے کہ وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا، کہہ دیجیے کہ میرا رب ان کی تعداد کو خوب جانتا ہے تو ان کی خبر کم ہی لوگوں کو ہے تو آپ ان کے بارے میں صرف سرسری گفتگو کیجیے اور ان میں کسی سے ان کے بارے میں مت پوچھیے)

اصحاب کہف کی تعداد کا مسئلہ بہت دقت طلب ہے، ان کی تعداد کے معاملہ میں لوگ بڑی الجھن میں پڑ گئے، اس لیے کہ سب نے نہیں دیکھا تھا، ظاہر ہے مجمع میں ہر ایک کہاں دیکھ سکتا تھا کہ کتنے آدمی تھے، اسی لیے جس نے جتنے دیکھے اتنے بیان کیے، کسی نے کہا؛ تین آدمی تھے چوتھا ان کا کتا تھا، اور کسی نے کہا؛ پانچ آدمی تھے چھٹا ان کا کتا تھا، اور کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو کہتے تھے کہ ان کی تعداد سات کی ہے اور آٹھواں ان کا کتا تھا، ارشاد ہوتا ہے کہ اے نبی! کہہ دیجیے کہ میرا رب ان کی تعداد کو زیادہ جانتا ہے، اصل تعداد بہت تھوڑے ہی لوگ جانتے ہیں، ظاہر ہے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے پہلی فرصت میں دیکھا ہوگا وہی اصل تعداد جانتے ہوں گے، باقی لوگ اندازہ لگا رہے ہیں، گویا سب نے اپنا اپنا اندازہ لگایا، اس لیے کہ جو چیز نہیں دیکھی تھی اس میں اندازہ ہی سے کام چلا رہے تھے، "رجم" پتھر مارنے کو کہتے ہیں، اب پتھر جس طرف لگ جائے وہی درست ہے، اسی طرح ایک بات کہہ دی شاید وہی صحیح ہو۔

اللہ تعالیٰ نبی ﷺ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ کہہ دیجیے میرا رب ان کی صحیح تعداد جانتا ہے، اور یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ اس میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں ہے، اصل تو اس واقعہ سے عبرت مقصود ہے، یہاں اصحاب کہف کا جو قصہ بیان کیا جا رہا ہے یہ محض تاریخ کا کوئی واقعہ نہیں بیان ہو رہا ہے، جس سے ایک تاریخی بات معلوم ہو جائے، بلکہ یہ واقعہ عبرت کے لیے بتایا گیا ہے، لہٰذا ان لوگوں کی صحیح تعداد کو اللہ تعالیٰ نے اپنے علم میں رکھا ہے، اس کا تعلق اللہ سے ہے، ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ اس واقعہ سے ہم کو کیا عبرت حاصل ہوتی ہے۔ اسی لیے نبی اکرم ﷺ سے فرمایا گیا کہ آپ اس مسئلہ میں ان لوگوں کے ساتھ زیادہ جھگڑا نہ کیجیے، ہاں ظاہری طور پر بار صاف رکھیے، اور ان میں سے کسی سے مت پوچھیے، اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، یہ مسئلہ زیادہ غور و فکر کا نہیں ہے، اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس واقعہ سے ہمیں کیا عبرت حاصل ہوتی ہے، اس واقعہ سے ہم یہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ ہی سب کچھ کر سکتا ہے اور وہ کرتا رہتا ہے، ایسا نہیں ہے کہ اتفاقاً ایسا واقعہ پیش آ گیا ہو، بلکہ وہ اپنی قدرت کے مناظر دکھاتا رہتا ہے۔

﴿وَلَا تَقُولَنَّ لِشَيْءٍ إِنِّي فَاعِلٌ ذَٰلِكَ غَدًا ۝ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ وَاذْكُر رَّبَّكَ إِذَا نَسِيتَ وَقُلْ عَسَىٰ أَن يَهْدِيَنِ رَبِّي لِأَقْرَبَ مِنْ هَٰذَا رَشَدًا﴾ (الکہف: ۲۳-۲۴)

(اور کسی چیز کے بارے میں یہ ہرگز نہ کہیے کہ اس کو میں کل کرنے والا ہوں، ہاں (یہ کہیے) کہ اللہ چاہے گا تو (کرلوں گا) اور جب کبھی ذہن سے اتر جائے تو اپنے رب کو یاد کیجیے اور کہیے کہ امید ہے کہ میرا رب اس سے زیادہ نیکی کی راہ مجھے سجھا دے گا)

آپ ﷺ سے جب اصحاب کہف کے متعلق پوچھا گیا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا تھا: یہ واقعہ ہم کل بتائیں گے، یعنی اللہ سے پوچھ کر بتائیں گے، اور اس وقت آپ ﷺ نے انشاء اللہ نہیں کہا تھا، اور اللہ تعالیٰ جس کی ذات بے انتہا غنی ہے، اسی لیے اللہ حضور ﷺ کو ایک نصیحت کے بطور مخاطب کرتے ہوئے تمام مسلمانوں کو ہدایت دیتا ہے، اور اسی لیے اس بات کو قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے، ورنہ جو بات سارے مسلمانوں کو بتانے کی نہیں ہوتی وہ قرآن مجید میں نہیں کہی جاتی۔ فرمایا؛ آپ کسی چیز کے متعلق یہ نہ کہیں کہ میں کل ایسا کروں گا، مگر یہ کہہ کر کہ اگر اللہ چاہے گا۔ یعنی آپ جو بھی کام کریں انشاء اللہ کہہ کر کرنا چاہیے، کسی بھی کام کو اپنے اوپر نہیں لینا چاہیے، اس لیے کہ مستقبل میں کیا ہونے والا ہے وہ نہ آپ کے علم میں ہے، اور نہ اختیار میں ہے، مثلاً: آپ کہتے ہیں ہم فلاں کام کریں گے، اور اگر اس کام کو نہ کر سکے تو آپ کا وعدہ جھوٹا ہوگا، ہاں اگر اللہ چاہے گا تو یقیناً ہو جائے گا اور طریقہ صحیح ہے۔

فرمایا؛ جب آپ بھول جائیں تو اپنے رب کو یاد کیجیے، یعنی اگر اس بات کو بھول جائیں تو اللہ تعالیٰ سے اپنی بھول کا ذکر کیجیے اور معافی مانگ لیجیے، اور یہ کہیے کہ اللہ سے امید ہے کہ اللہ مجھ کو صحیح راستہ پر جو کہ رشد و ہدایت کا راستہ ہے، مجھے اس کی ہدایت دے گا، اور مجھ کو بالکل صحیح راستہ پر چلائے گا۔

﴿وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِئَةٍ سِنِينَ وَازْدَادُوا تِسْعًا﴾ (الکہف: ۲۵)

(اور وہ اپنے غار میں تین سو سال ٹھہرے اور مزید نو سال)

فرمایا؛ وہ لوگ اس غار میں تین سو سال اور اس پر نو سال زیادہ رہے، یہ تین سو سال سورج کے اعتبار سے ہوتے ہیں، یعنی شمسی جنتری کے اعتبار سے تین سو سال ہوتے ہیں، اور پھر اس میں نو سال اور بڑھ جاتے ہیں، اس لیے کہ ہر شمسی سال پر تین سال بڑھتے ہیں، کیونکہ ہر شمسی سال میں گیارہ روز بڑھ جاتے ہیں، تو قمری لحاظ سے تین سو سال ہوئے اور شمسی لحاظ سے تین سو نو سال ہوئے۔

اسلامی طرزِ فکر کا فقدان

مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ

موجودہ دور کی سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ ہم مسلمانوں نے پوری دنیا میں اپنی ذمہ داریوں کو پس پشت ڈال دیا ہے، اور اس کا نتیجہ ہے کہ ہمارا کام غیروں نے شروع کر دیا ہے، اور جب ہمارا کام غیروں نے شروع کیا تو ایسا کیا کہ وہ خرابی ہمارے گھر میں بھی آ گئی، میں اس کی ایک مثال دیتا ہوں کہ آج کل کالجوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے، ان میں ایسے بہت سے علوم ہیں جن کا پڑھنا ضروری ہے، جیسے ڈاکٹری ہے، مسلمان کے لیے بھی ڈاکٹری کا پڑھنا ضروری ہے، تاکہ وہ علاج کر سکے، ایسے بہت سے دینی مسائل ہیں، جن میں مسلمان ڈاکٹر کا ہی فیصلہ مانا جاتا ہے، لہٰذا ایسی صورت میں مسلمانوں کو ڈاکٹر بھی ہونا چاہیے، اسی طرح مسلمانوں کی ایک تعداد کو انجینئر بھی ہونا چاہیے، اور بہت سارے مسلمانوں کو سائنسی علوم بھی پڑھنا چاہیے، بلکہ ہماری اصل ذمہ داری تو یہ تھی کہ آج جو بھی علوم پڑھائے جا رہے ہیں، ہم ان سب کی سرپرستی کرتے، اور جو سائنسی علوم ہیں، ہم ان کو مسلمان کر لیتے، تاکہ سماج میں ان کے اچھے اثرات مرتب ہوتے، لیکن ہم اور آپ گھروں میں بیٹھ گیے اور ان سب شعبوں کو چھوڑ دیا، یہاں تک کہ ان چیزوں کو غیروں نے اختیار کر لیا، اور جب غیروں نے اختیار کیا تو اپنے غیر پن اور بے جا تصرف کے ساتھ اختیار کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج ڈگریاں خدمت کے نام پر تقسیم ہوتی ہیں، مگر ڈاکٹر لوٹنے والے بن رہے ہیں، اور دوسرے ڈگری ہولڈرس کا بھی یہی حال ہے کہ وہ اپنے ہی ملک کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔

ایک صاحب سے میں نے معلوم کیا کہ MBA میں کیا پڑھایا جاتا ہے؟ انہوں نے کہا: اس میں بنیادی طور پر اس بات کی ٹریننگ دی جاتی ہے کہ آپ دو روپیہ کی معمولی چیز کو دو سو روپئے میں کیسے بیچ سکتے ہیں، ہم نے کہا: اگر یہی علم مسلمانوں کی ماتحتی میں دیا جاتا، ہم اور آپ اس کے ذمہ دار ہوتے تو یہی MBA سارے مسلمانوں کے لیے خیر کا ایک ذریعہ ہوتا، کیونکہ اسلام میں کسی کی جیب ناحق خالی کرانے کا تصور نہیں ہے، اسلام کہتا ہے کہ تم دوسرے کو فائدہ پہنچاؤ اور خود بھی فائدہ اٹھاؤ، نہ نقصان پہنچاؤ اور نہ نقصان اٹھاؤ، نہ کسی کو تکلیف پہنچاؤ اور نہ خود تکلیف اٹھاؤ۔ لیکن ان علوم سے مسلمانوں کی کنارہ کشی کے سبب آج جن لوگوں کا ان پر قبضہ ہے، ان کے یہاں سب جائز ہے، وہ اس بات کو سکھانا بھی ہنر سمجھتے ہیں کہ چوری کس طرح کی جائے، کسی کو بیوقوف کس طرح بنایا جائے، جب کہ یہ تمام حرکتیں ملک کے لیے انتہائی نقصان دہ ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ موجودہ سماج ظلم اور کرپشن کی آخری حد کو پہنچ چکا ہے۔

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ بحیثیت مسلمان ہماری بڑی ذمہ داریاں ہیں، ہمیں یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ جو جانتا ہے اور جو نہیں جانتا، وہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے، آپ جانتے ہیں کہ یہ کام ایسے کیا جائے گا، لیکن آپ نہیں کرتے تو یہ آپ کی کمزوری اور نالائقی ہے، اور آپ کو ذمہ داری چھوڑ دینے کی بیماری ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہی کام ایسا شخص کرے گا جو اناڑی ہے، ظاہر ہے کہ ایسا شخص اناڑی پن سے کام کرے گا اور بڑی تباہی مچا دے گا۔

اسلام کا نظریہ ہے کہ تم اپنے ملک کو فائدہ پہنچاؤ، اپنوں اور غیروں سب کو فائدہ پہنچاؤ، سب کے ساتھ اچھا سلوک کرو، اور سب کے ساتھ اچھا معاملہ کرو، اور اس کے لیے زمانہ کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر کام کی مختلف شکلیں بھی اختیار کرو، لیکن جب ہم نے اس میں حد درجہ کوتاہی برتی، تو غیروں نے ہاسپٹل قائم کیے، کالجز قائم کیے اور اس کے ذریعہ سے انہوں نے ہمارا ایمان کھینچنا شروع کیا، ہمارے ایمان کا رس چوسنا شروع کیا، اور ہم اطمینان سے بیٹھے رہے، اور اپنے بچوں کو بھی ان کے یہاں اطمینان سے بھیجتے رہے، ہماری اس بے جا اطمینانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے ہماری نئی نسل سے ایمان کے رس کو بالکل چوس لیا اور اندر سے کھوکھلا کر دیا، اور اس پر بھی مزید بے غیرتی کی بات یہ ہے کہ ہم ابھی بھی اس صورت حال کو برداشت کر رہے ہیں، جب کہ ہماری ذمہ داری یہ تھی کہ یہ سب کام ہماری نگرانی میں ہوتے، تاکہ نئی نسل کا ایمان پوری طرح محفوظ ہی نہیں بلکہ اور مضبوط ہو جاتا۔ اسلامی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ خدمت خلق کے جتنے بھی کام ہیں، خواہ وہ ہاسپٹل کی شکل میں ہوں یا

کالج کی، وہ سب مسلمانوں کے کام تھے، آپ تاریخ پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ مسلم بادشاہوں نے ہر دو کلو میٹر پر ایک سرائے بنوائی، ایک ہاسپٹل بنایا، کنواں کھدوایا اور جگہ جگہ پانی کا انتظام کیا۔ لیکن اب صورت حال بالکل برعکس ہے، اب یہی سب کام غیر کر رہے ہیں، اور ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں۔

آج ہم مسلمانوں کے دل ودماغ میں صرف یہ بیٹھ گیا ہے کہ کھانا کمانا ہمارا کام ہے، حالانکہ صرف یہ کام تو جانوروں کا تھا، حضرت مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''ارکان اربعہ'' میں لکھا ہے کہ آج کل ہم لوگوں کا معاملہ صرف کھانے اور کمانے کی حد تک رہ گیا ہے، کھانا اس لے کہ کمائیں، اور کمانا اس لیے کہ کھائیں، اسی لیے اب ہماری زندگی کی ساری تگ ودو صرف دو جگہ باقی رہ گئی ہے؛ یعنی ڈائینگ روم سے بیت الخلاء تک، گویا ہمارا بس اتنا کام رہ گیا ہے۔ غور کا مقام ہے! کیا یہ بھی کوئی کام ہے انسان کا، انسان کا کام تو یہ ہے کہ وہ انسانیت کا سبق سکھائے، اور ہر وقت اس فکر میں رہے کہ اپنی ذات سے دوسروں کو کس طرح نفع پہنچائے۔

دوسروں کو نفع پہنچانے کی ایک ادنی مثال گرمی کے موسم میں یہ ہے کہ مسجد میں ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ جہاں پنکھا چل رہا ہو، وہ اسی کے ٹھیک نیچے نماز ادا کرے، تاکہ راحت ملے، اب اگر کوئی شخص ثواب کی نیت سے دوسرے کے لیے پنکھا چھوڑ دے تو ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے، کیونکہ وہ دوسروں کو نفع پہنچا رہا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کے ساتھ کھانا کھا رہا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ ساتھ کھانے والے کو ترجیح دے، یعنی کوشش یہ ہو کہ وہ شخص اچھا کھالے اور ہم اپنا ہاتھ روک لیں۔ اس سے ایسی غیر معمولی روحانی ترقی ہوتی ہے جو کہ بڑے بڑے اعمال سے نہیں ہوتی، اس لیے کہ ایسے وقت میں نیک نیت کی بنیاد پر نقد معاملہ ہوتا ہے، مثلاً: ہمارے سامنے دسترخوان پر دو ایسی چیزیں رکھی ہوئی ہیں جو بہت لذیذ ہیں، آپ نے فوراً وہ دونوں اٹھالیں اور سامنے والا محروم رہ گیا، حالانکہ اگر اس موقع پر آپ برادشت کر لیتے اور سامنے والے کو ترجیح دیتے تو اس سے روحانی ترقی بہت ہوتی، اسی طرح ایسے بہت سے چھوٹے اعمال ہیں، جن سے غیر معمولی روحانی نفع نصیب ہوتا ہے، اسی لیے اللہ کے نیک بندے چھوٹی چھوٹی چیزوں پر خاص نگاہ رکھتے ہیں، کیونکہ وہ بڑے لوگ ہوتے ہیں اور ان کی روشنی بھی بہت تیز ہوتی ہے، جس کی بنیاد پر انہیں چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی بآسانی نظر آجاتی ہیں۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآن وحدیث سے ہمارا تعلق زیادہ سے زیادہ قائم ہوجائے اور اسی کے ساتھ رسول پاک علیہ الصلاۃ والسلام کا اسوۂ حسنہ بھی ہمارے سامنے ہونا چاہیے کہ رسول پاک علیہ الصلاۃ والسلام کا اسوہ کیا ہے؟ اس کو دیکھ کر ہم آگے بڑھیں گے تو ہماری دنیا کا پورا نظام صحیح ہوجائے گا، ہر شخص اس فکر میں رہے گا کہ ہم دوسرے کو فائدہ کیسے پہنچائیں۔ اس وقت کا ایک بڑا مرض خود غرضی ہے، ظاہر ہے ایسے میں جو شخص دوسروں کو ترجیح دے گا، اس کو روحانی اعتبار سے غیر معمولی ترقی حاصل ہوگی، اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو غیر معمولی قبول فرمالے گا، اور اس کا قد بڑے سے بڑا ہوتا چلا جائے گا، لیکن نیت ٹھیک ہونا بہت ضروری ہے، اور اگر انسان کی نیت ہی ٹھیک نہیں تو کوئی فائدہ نہیں، پھر وہ چاہے کتنی بھی محنت کر رہا ہو کچھ بھی حاصل ہونے والا نہیں، اس لیے کہ نیت غلط ہے، نیت ہر حال میں اچھی ہونی چاہیے، ورنہ نیکی کر اور دریا میں ڈال والی بات ہے، ساری نیکی اور اچھے کام بیکار ہیں، اور اگر نیت ٹھیک ہو اور خالص اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے کام کر رہا ہے تو اس سے زیادہ عقل مند کوئی نہیں ہے، اور اس کے مقابلہ میں جو شخص اطمینان سے بیٹھا ہوا ہے، اس سے زیادہ بے وقوف کوئی نہیں ہے۔

آج سب سے بڑھ کر ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی سوچ کو بدلیں اور صحیح سوچ پیدا کریں، ہمارا حال یہ ہے کہ ہم چھوٹی چھوٹی چیزوں میں ہی الجھے رہتے ہیں، تاکہ کوئی بڑا کام نہ کر پائیں، ایک ساتھ بیٹھ نہ پائیں، اتحاد کی لڑی پرونے نہ پائیں، اور سب مل کر اسلام کو آگے بڑھانے نہ پائیں، یاد رکھیے یہ شیطان کا کام ہوتا ہے کہ ان کو الجھا دو۔ اس نے ہمیں ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھا دیا ہے کہ بس ہمارا ایک ہی کام رہ گیا ہے، ہم ٹانگیں کھینچتے رہیں، اور جو شخص کام کر رہا ہے، اس کو کسی طرح بھی نہ کرنے دیں، اس کے راستہ میں ہم اس طرح روڑے لگاتے رہیں کہ وہ آگے نہ بڑھنے پائے، ظاہر ہے یہ اسلامی طرز فکر نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے اور ہماری سوچ کو صحیح کر دے۔ آمین

گذشتہ سے پیوستہ

ایثار و مواسات کیا ہے؟

بلال عبدالحی حسنی ندوی

دسترخوان پر ایثار:

"عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: طَعَامُ الْوَاحِدِ يَكْفِي الْإِثْنَيْنِ، وَطَعَامُ الْإِثْنَيْنِ يَكْفِي الْأَرْبَعَةَ، وَطَعَامُ الْأَرْبَعَةِ يَكْفِي الثَّمَانِيَةَ." (مسلم: ۲۰۵۹)

"حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ایک آدمی کا کھانا دو آدمیوں کے لیے کافی ہوجاتا ہے، اور دو آدمیوں کا کھانا چار آدمیوں کے لیے کافی ہوجاتا ہے، اور چار کا کھانا آٹھ کے لیے کافی ہوجاتا ہے۔"

آپ ﷺ نے یہاں یہ بات اس لیے فرمائی ہے کہ آدمی دینے اور کھلانے میں بخل نہ کرے، کوئی آدمی بیٹھا کھانا کھا رہا ہے، جو کہ تین آدمیوں کا کھانا ہے، اتنے میں اور لوگ بھی آگئے، تو اب اس کا دل تنگ نہ ہو، اور وہ یہ نہ کہے کہ کھانا تھوڑا ہے، تمہارے آنے کا یہ کوئی وقت ہے؟ تم بے وقت آگئے، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایسا نہیں کہنا ہے بلکہ سوچنا چاہیے کہ دو کا کھانا چار کو کافی ہوتا ہے اور تین کا کھانا چھ کو کافی ہوتا ہے اور چار کا آٹھ کو کافی ہوتا ہے، اب اگر تم پانچ آدمی بیٹھے کھانا کھا رہے ہو اور دو چار آدمی اور آگئے تو دل چھوٹا کرنے کی ضرورت نہیں ہے، آپ فوراً یہ حدیث یاد کرلیں کہ ہم جو کھا رہے ہیں، یہ انشاء اللہ سب کے لیے کافی ہوگا، لیکن بسم اللہ پڑھنا نہ بھولیں، ورنہ شیطان بھی ساتھ کھائے گا، حدیث میں آتا ہے کہ آدمی جب بسم اللہ نہیں پڑھتا تو اس کا کھانا شیطان کھاتا ہے، وہ کم کھاتا ہے، شیطان زیادہ کھاتا ہے، اور جب آدمی بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کرتا ہے تو یہ کھانا اس کے لیے جزو بدن بنتا ہے، اس کا ایک ایک ذرہ اس کے لیے مفید ہوتا ہے، اور طاقت کا ذریعہ بنتا ہے، لہٰذا آدمی بسم اللہ پڑھ کر سنت کے مطابق کھانا کھائے، اور اپنا معدہ حلق تک نہ ٹھوسے، جیسا کہ ہم لوگ کرتے ہیں کہ بھوک نہ لگی ہو مگر پھر بھی جب کھانے پر آتے ہیں تو کھاتے چلے جاتے ہیں، یہ سنت کے خلاف عمل ہے، حدیث میں آتا ہے کہ اگر کھانا کھانا ہے تو اپنے پیٹ کے تین حصے کرلو، ایک حصہ کھاؤ، ایک حصہ پانی کے لیے رکھو، اور ایک حصہ اپنی سانس کے لیے رکھو، تاکہ سانس لینے میں دشواری نہ ہو، لیکن ہم لوگوں کا مزاج دوسرا ہے، ہم کہتے ہیں کہ حلق تک ٹھونس لیں گے اور پھر پانی اپنی جگہ خود ہی بنا ہی لے گا، اور سانس آئے یا نہ آئے، دیکھا جائے گا، ظاہر ہے یہ نامناسب طرز فکر ہے۔

اسلامی طریقہ:

آدمی یہ سمجھ کر کھانا کھائے کہ ہمیں پیٹ ٹھونس کر نہیں بھرنا ہے، جب یہ مزاج ہوگا تو واقعہ یہ ہے کہ کھانا اچھا خاصا معلوم ہوگا، جب تین آدمیوں کے لیے کھانا تیار کیا جائے گا، اور اگر بعد میں دو یا تین آگئے، تو اس میں کوئی پریشانی نہیں ہے، وہ بھی کھالیں گے، لیکن اگر تم یہ سوچو کہ ہم حلق تک بھرلیں، تو یہ شرمناک بات ہے، البتہ اتنا کھانا ضرور ہوگا کہ تمہارا پیٹ بھر جائے گا اور تم آسودہ ہوجاؤ گے، تمہاری ضرورت پوری ہوجائے گی، اور سنت کے مطابق کھانا ہوگا۔ معلوم ہوا آپ ﷺ نے مذکورہ حدیث میں جو فرمایا ہے، یہ اس کے لیے ہے جو اسلام کے تقاضوں کو سمجھ کر کام کرے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا معاملہ عجیب ہے، ایک حدیث میں آتا ہے کہ

"الكافر يأكل في سبعة أمعاء والمؤمن يأكل في معى واحد" (سنن الترمذی: ۱۹۳۱)

یعنی ایمان والا جو کھاتا ہے وہ ایک آنت میں کھاتا ہے، گویا ایک معدہ میں کھاتا ہے اور جو ایمان والا نہیں ہوتا ہے، دنیا ہی کو سب کچھ سمجھتا ہے تو وہ اپنا معدہ پھلاتا رہتا ہے، تاکہ بڑھتا جائے اور غذا بھی بڑھتی جائے، فرمایا کہ وہ جو کھاتا ہے وہ سات گنا کھاتا ہے۔

اسی حدیث کے ضمن میں ایک واقعہ بھی بیان فرمایا گیا ہے کہ ایک صاحب آئے اور ایمان لانے سے پہلے انہوں نے صحابہ کے ساتھ کھانا کھایا اور وہ کھاتے ہی چلے جاگئے، سات گلاس دودھ پی گئے اور بھی بہت کچھ کھالیا، اور اس کے بعد اللہ کے رسول ﷺ کے ہاتھ پر اسلام لائے، پھر جب کھانے کے لیے بیٹھے تو ان کے سامنے ساتواں حصہ رہ گیا، جس سے وہی بات سامنے آئی، جس کو حضور ﷺ نے فرمایا تھا، یعنی جتنا انہوں نے شام کو اس سے پہلے کھایا تھا،

اس کے مقابلہ میں قبول اسلام کے بعد جب کھانے بیٹھے تو اس کا ساتواں حصہ رہ گیا، یعنی گویا کہ ایک معدہ میں کھایا، اس کی وجہ یہی ہے کہ جب کافر کھاتا ہے، اللہ کا منکر و باغی کھاتا ہے، تو وہ بالکل بے فکر ہو کر کھاتا ہے، وہ سوچتا ہے کہ کھاؤ اور مرو، دنیا میں کھانا ہے، جینا ہے، مرنا ہے، کھانا ہے کمانے کے لیے، کمانا ہے کھانے کے لیے، اور اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے، زندگی کی چکی اسی طرح چل رہی ہے، آدمی صرف اسی لیے کھاتا ہے کہ طاقت آئے اور مزا آئے، اور خوب کمائے اور کماتا اس لیے ہے کہ خوب کھائے، گویا زندگی کھانے اور کمانے کے درمیان گردش کر رہی ہے۔ لیکن ایمان والا اس انداز سے نہیں رہتا، وہ کھاتا ہے کہ طاقت آئے، اور اللہ کی بندگی میں سہولت ہو، اس کا یہ مقصد ہوتا ہے، اللہ کی بندگی کے لیے وہ کھاتا ہے، تاکہ سہولت ہو، طاقت آئے گی تو کام کرنا آسان ہوگا، خدمت کرنا، عبادت کرنا اور دین کے تقاضوں کو پورا کرنا آسان ہوگا، لہٰذا جب صاحب ایمان کا مقصد اچھا ہوتا ہے، تو وہ اتنا کھاتا ہے جو اس کے لیے مفید ہو، ایسا نہیں کھاتا کہ کھانے کے بعد ڈھیر ہو جائے اور اس کی جان کے لالے پڑ جائیں، معدہ خراب ہو جائے، ڈکاریں آنے لگیں، یہ تو ایسا شخص کرتا ہے جس کو آگے کی فکر ہی نہ ہو۔

فساد زندگی کا سبب:

آپ ﷺ نے حدیث میں جو بات فرمائی، اس سے بنیادی طور پر اس باب کی یہی مناسبت ہے کہ آدمی دینے میں تنگی محسوس نہ کرے، کھلانے میں تنگی محسوس نہ کرے، اگر دسترخوان پر کھانا کھا رہا ہے اور کوئی آکر بیٹھ گیا تو یہ نہ سوچے کہ یہ آگیا اب ہمارا کیا ہوگا، تنگی بالکل محسوس نہ کرے، یہ سوچے کہ یہ کھا رہا ہے، یہ اپنی جگہ کھائے گا، یہ اپنا رزق کھائے گا، اور دوسرے یہ کہ جب کھانا ایک آدمی کا ہے تو وہ دو کو کافی ہو جائے گا اور اگر دو کا ہے تو چار کو کافی ہو جائے گا، واقعہ یہ ہے کہ اگر ہم شریعت وسنت کا خیال کر کے اپنے سارے معاملات انجام دیں، ہمارا کھانا پینا، جاگنا سونا، اٹھنا بیٹھنا، سب سنت کے مطابق ہو، حضور ﷺ نے جو طریقہ بتایا ہے، اس کے مطابق ہو تو ہماری زندگی کا نظام درست ہو جائے، ہماری صحت کا نظام درست ہو جائے اور ہمارے حالات درست ہو جائیں، آج بگاڑ کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ ہم نے آپ ﷺ کے طریقہ کو چھوڑ دیا ہے اور اسلامی تعلیمات میں جو توازن رکھا گیا ہے اس کو ہم قائم نہیں کرتے، ہمارے یہاں جو اتار چڑھاؤ ہے، کہیں نشیب ہے، کہیں فراز ہے، کہیں لگتا ہے کہ آسمان کی بلندیوں پر جا رہے ہیں، اور کہیں لگتا ہے کہ تحت الثریٰ میں پہنچ گئے، ایک طرف بہت اونچے اور ایک طرف بالکل گندگی میں، اس کی بنیادی وجہ یہی ہے۔

حقوق کی رعایت:

اسلام جو تعلیم دیتا ہے وہ یہ کہ اپنی پوری زندگی کو توازن کے ساتھ گزارنے کی کوشش کرو، اور پوری زندگی میں تم دین کو اختیار کرو اور ہر ایک کے حق کو سمجھو، جب ایسا سمجھو گے تو ہر ایک کا حق ادا کرو گے، اور اگر تم ہر ایک کے حق کو نہیں سمجھو گے تو اسی کا حق صرف ادا کرو گے جس سے تمہارا جی لگ رہا ہے، اور جس سے جی نہیں لگ رہا ہے، اس کا حق ادا نہیں کرو گے، اور اگر اللہ کی طرف سے دیئے گئے قانون کو سمجھو گے اور ہر ایک کے فرق کو سمجھو گے، تو اس کے مطابق حق ادا کرو گے، ماں باپ کا حق اپنی جگہ پر ہے، بیوی کا حق اپنی جگہ پر ہے، اولاد کا حق اپنی جگہ پر ہے، اور دوسرے جو پڑوسی ہیں ان کا حق اپنی جگہ پر ہے، اور اللہ کا حق اپنی جگہ پر ہے، یہ سارے حقوق اللہ نے ہمیں دیے ہیں، ان حقوق کو ہمیں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اب اگر ہم اس فرق کو نہ سمجھیں تو پھر ہم تباہی کی طرف چلے جائیں گے، ماں باپ کا حق سب سے بڑھ کر ہے، قرآن میں سب سے زیادہ اس کی اہمیت بیان کی گئی ہے، ارشاد ہے

﴿أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ﴾ (لقمان: ١٤) (کہ میرا حق پہچانو اور اپنے ماں باپ کا حق پہچانو)

آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بعد ماں باپ کا حق بتایا ہے کہ میرا احسان مانو اور اپنے ماں باپ کا احسان مانو، انہوں نے تمہارے ساتھ کتنا اچھا برتاؤ کیا، کیسی مصیبتیں اور مشقتیں اٹھائیں، اور تمہیں پالا پوسا، تمہاری ضروریات کا خیال رکھا، تمہارے اوپر ان کا اتنا احسان ہے کہ دنیا میں کسی کا وہ احسان نہیں ہے، اس سے پتہ چلا کہ بیوی سے زیادہ حق ماں باپ کا ہے، اولاد سے زیادہ حق ماں باپ کا ہے، تمام لوگوں سے زیادہ حق ماں باپ کا ہے، حقوق کی ترتیب یہ ہے کہ والدین، بیوی، بچے، پھر جو ذوی الارحام ہیں، جن سے مراد چچا، چچازاد بھائی وغیرہ ہیں اور جو قریبی رشتہ دار ہیں ان کا

حق ہے، پھر پڑوسیوں کا حق ہے۔

سب سے بڑا حق:

لیکن سب سے پہلے یہ بات سمجھنے کی ہے کہ سب سے بڑا حق اللہ کا ہے، یہ بندوں کے جو حقوق ہیں، ان بندوں کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے، ماں باپ تو ذریعہ بن گئے کہ ہم دنیا میں آ گئے، لیکن پیدا کرنے والی ذات کون ہے؟ وہ اللہ کی ذات ہے، لہٰذا سب سے زیادہ حق اللہ کا ہے، اسی لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا کہ ان کی تم بات مانو، ان کی فرمانبرداری کرو، اور اگر وہ تمہیں کسی نافرمانی کی بات پر آمادہ کریں تو اللہ نے صاف کہہ دیا کہ ان کی بات نہیں چلے گی، وہ کہتے ہیں کہ شرک کرو، کفر کرو، فلاں کی قبر پر سجدہ کرو، فلاں مندر میں جاؤ، کسی مورتی کے آگے اپنی پیشانی ٹیکو، تو یاد رہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا حق سب سے بڑھ کر ہے، یہاں ماں باپ کی بات نہیں چلے گی، وہ بھی اللہ کے بندے ہیں، اس کے غلام ہیں، اور ہم بھی اللہ کے غلام ہیں، یقیناً وہ ماں باپ ہیں اور ان کا بہت بڑا درجہ ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف انہوں نے کوئی بات کہہ دی تو ان کی بات ہرگز نہیں چلے گی، اور اگر کوئی شخص ماں باپ کی رضا کے لیے رب کی مرضی کے خلاف کوئی بات کہتا ہے تو اللہ کے یہاں اس کی پکڑ ہوگی کہ تم کون ہوتے ہو؟ تمہارے ماں باپ کون ہوتے ہیں؟ ہم نے تمہیں زندگی گذارنے کا جو طریقہ بتایا اور ہم نے تمہیں تاکید کی کہ ہمارے ساتھ شرک نہ ہو، اس کے بعد تم شرک کرتے ہو؟ اس کے بعد تم اس مسئلہ میں جب کہ تم ہماری نافرمانی کی بات کہی جارہی تھی، ماں باپ کی بات مانتے ہو؟ ظاہر ہے وہاں والدین کی بات نہیں مانی جائے گی، لیکن اگر ماں باپ ایسے ہی کوئی بات کہہ رہے ہیں تو ان کی بات مانی جائے گی، اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مجید میں یہ بات فرمائی کہ اگر ماں باپ نافرمانی کی کوئی بات کہتے ہیں تو ان کی بات نہ مانو، لیکن دنیا میں ان کے ساتھ سلوک کرتے رہو، ان کے ساتھ اچھا معاملہ کرو، ان کو تکلیف مت پہنچاؤ، اور اگر وہ اللہ کے خلاف کوئی بات کہتے ہیں، اس کے حکم کے خلاف کوئی بات کہتے ہیں، تو ہرگز ہرگز ان کی بات نہیں مانی جائے گی، ارشاد الٰہی ہے: ﴿وَإِن جَاهَدَاكَ عَلَى أَن تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا﴾ (لقمان: ۱۵) (اور اگر وہ تمہیں اس پر مجبور کریں کہ تم میرے ساتھ شرک کرو جس کا تمہیں کوئی علم نہیں تو ان کی بات مت ماننا اور دنیا میں ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیے جانا)

حقوق میں ترجیح کی مثال:

اس کو یوں سمجھ سکتے ہیں، گرچہ دنیا میں اس کی مثال بہت چھوٹی ہوگئی، ظاہر ہے اللہ کا مقام ومرتبہ اور اس کی بلندی کا ہم تصور ہی نہیں کرسکتے، اللہ ہی بڑا ہے، اسی کو بڑائی زیبا ہے، اس کے سامنے کوئی بڑا نہیں ہے، آدمی مقابلہ کرتا ہے کہ فلاں بڑا ہے، اور اسی طرح ہم لوگ ''اللہ أکبر'' کا ترجمہ کرتے ہیں کہ اللہ سب سے بڑا ہے، لیکن غور کیا جائے تو مناسب ترجمہ یہ ہے کہ اللہ ہی بڑا ہے، اس میں ''سب سے'' لگانے کی ضرورت نہیں ہے، واقعہ یہ ہے کہ اللہ ہی بڑا ہے، بڑائی اسی کو زیبا ہے، کسی کو اور زیبا نہیں ہے، اس تناظر میں اگر دیکھا جائے تو مثال بہت چھوٹی ہوجائے گی، لیکن سمجھانے کے لیے نذر قارئین ہے:

ایک طرف آپ کی ماں کوئی بات کہے اور ایک طرف محلّہ کا کوئی معمولی لڑکا کچھ کہے، ایسی صورت میں آپ کیا کریں گے؟ اپنی ماں کی مانیں گے یا محلّہ کے لڑکے کی، جس سے کوئی خاص تعلق بھی نہیں ہے؟ ظاہر ہے ماں کی بات مانی جائے گی، بلکہ اگر بیوی آپ سے کوئی بات کہہ رہی ہے اور اسی کے مقابل ماں کوئی بات کہہ رہی ہے تو بھی ایسی صورت میں ماں کی بات مانی جائے گی، لیکن جب معاملہ اللہ کا آجائے گا تو وہاں کسی کی نہیں مانی جائے گی، نہ ماں کی، نہ باپ کی، نہ پڑوسی کی، نہ آقا کی، نہ اس کی جس کے آپ دست نگر ہیں، خواہ وہ بہت سلوک کرنے والا اور نوازنے والا ہو، اس لیے کہ سب سے بڑھ کر دینے والا اللہ تبارک وتعالیٰ ہے، ہماری زندگی اسی کی دی ہوئی ہے، ہماری زندگی کو باقی رکھنے والا وہی ہے۔

حاصل بحث یہ کہ ہمیں اس تفاوت کو سمجھنے کی ضرورت ہے، اس فرق کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ کس کا کیا حق ہے اور اس کو کس طرح سے ہمیں ادا کرنا ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں اسلام کی یہ تعلیم دی ہے، اس تعلیم کے مطابق ہمیں اپنی زندگی گزارنی ہے، ہم اسلام پر ہی باقی رہیں اور ایمان پر ہی اللہ تعالیٰ ہمیں موت عطا فرمائے، اور اپنے نیک بندوں کے ساتھ ہمارا حشر فرمائے۔ آمین

ایمان وعمل کا حقیقی معیار

عبدالسبحان ناخداندوی

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئُونَ وَالنَّصَارَى مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ (بے شک جولوگ ایمان لائے اور جولوگ یہودی ہوئے اور نصاری وصائبین، جو بھی اللہ پر اور آخرت پر ایمان لایا اور اچھے کام کیے تو ایسے کاموں کا اجران کے رب کے پاس ہے، اوران پر نہ کوئی خوف ہوگا نہ یہ غمگین ہوں گے)

تشریح سے پہلے یہ معلوم ہوجائے کہ یہ مبارک آیت ایمانیات کی تفصیل بتانے کے لیے نہیں اتری، اس لیے کسی کے ذہن میں یہ اشکال نہ آئے کہ اس میں تو اپنے اپنے دین پر رہتے ہوئے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کو کافی قرار دیا گیا ہے، لہٰذا رسولوں پر بالخصوص حضور ﷺ پر ایمان ضروری نہیں، ہر شخص اپنے مذہب کے دائرے میں رہتے ہوئے بس ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا قائل ہوجائے، اس کے لیے اجر یقینی اور جنت پکی ہے، آیت کا صحیح پس منظر نہ سمجھنے سے کسی کو دھوکا ہوسکتا ہے، یا وحدت ادیان کے قائل لوگ اس آیت کو الٹا مطلب پہنا کر کسی کو دھوکہ دے سکتے ہیں۔

اس لیے سب سے پہلے یہ سمجھ لیں کہ یہاں ایمانیات کی تفصیل بیان کرنی سرے سے مقصود ہی نہیں، ورنہ یہاں فرشتوں پر، کتابوں پر اور رسولوں پر ایمان کی بات ہی نہیں ہے، گویا اس لحاظ سے ان پر ایمان اعتقاد کا حصہ ہی نہیں؟ اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے، یہاں صرف یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ ناموں کے سہارے کسی جماعت میں شامل ہونا ہرگز کافی نہیں ہے، جب تک حقیقت ایمان پائی نہیں جائے گی تب تک اللہ کے یہاں نجات نہیں مل سکتی، یہود اس خطرناک غلطی کا شکار ہوچکے ہیں، لہٰذا مسلمان یہ نہ سمجھیں کہ وہ بھی ایمان والوں کے گروہ میں شامل ہوگئے تو ان کی نجات یقینی ہے، نہیں! بلکہ اللہ پر سچا ایمان اور آخرت پر پختہ یقین اور اس کے ساتھ عمل صالح ضروری ہے، جب تک یہ بنیاد قائم نہیں کی جائے گی، کوئی چاہے کسی گروہ سے جیسی بھی نسبت رکھے کچھ فائدہ نہیں، نام دراصل عنوان ہوتے ہیں اور عنوان حقیقت کو اجاگر کرنے کے لیے ہوتے ہیں، حقیقت کی پردہ پوشی کے لیے ہرگز نہیں، لہٰذا جس زمانہ میں صحیح دین کا جو بھی نام رہا ہو وہ اس حقیقت سمیت قابل قبول ہے، ورنہ قابل رد ہے، یہود کا یہ عقیدہ تھا کہ جو یہودی ہوگا وہ جنت میں جائے گا، اور یہودی کا مطلب صرف نسبت یہودیت کا حاصل ہونا قرار پایا، ان کی دیکھا دیکھی نصاری نے بھی یہی راگ الاپنا شروع کیا کہ جو بھی نسبت نصرانیت رکھتا ہو جنت اس کے حق میں ثابت، اللہ نے دونوں کے تصورات پاش پاش کردیے:

﴿وَقَالُوا لَن يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَن كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَى تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ☆ بَلَى مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِندَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ (یہودیوں نے کہا؛ جنت میں صرف یہود ہی جائیں گے، نصاری نے کہا؛ جنت میں صرف نصاری جائیں گے (حقیقت دین کسی کے پاس نہیں) یہ ان کی خام خیالی ہے، آپ کہیے؛ ثبوت لاؤ اگر تم سچے ہو، (وہ ثبوت یہ ہے) کیوں نہیں جو بھی اپنا رخ اللہ کے سامنے ڈال دے (پورا مطیع وفرمانبردار بن جائے) اور وہ دل کا بھی نیک ہو (مخلص ہو) تو اسے اپنے رب کے پاس اپنا اجر ملے گا، ایسے لوگوں پر نہ خوف ہوگا، نہ ان کو کوئی غم لاحق ہوگا)

یہاں یہ بھی بیان کرنا مقصود ہے کہ کہیں یہود ونصاری کی دیکھا دیکھی مسلمان بھی یہ کہنا شروع نہ کریں کہ جو بھی نسبت اسلام رکھے گا وہ جنت میں جائے گا، جہنم اس پر حرام ہوگی، جس طرح یہود ونصاری کی بات غلط، اہل اسلام کی بھی یہ بات غلط ہے، جب تک حقیقت اسلام نہیں پائی جائے گی جنت کا حصول ناممکن ہے، نسبت اسلام منافقین بھی رکھتے تھے، لیکن حقیقت دین سے محروم، لہٰذا جنت تو دور کی بات جہنم کے بھی سب سے نچلے طبقہ میں دھکیل دیے جائیں گے، ارشاد ہے ”بے شک منافقین جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں پڑے ہوں گے اور تم ان کے لیے کوئی مددگار نہیں پاؤ گے۔“

اس مبارک آیت میں دو بنیادی عقائد بیان کیے گئے ہیں جن کو تسلیم کرنے سے بقیہ تمام عقائد کا تسلیم کرنا اور اپنی عملی زندگی اس کے مطابق ڈھالنا آسان ہوجاتا ہے۔

من آمن باللہ؛ اللہ پر ایمان عقائد وتصدیقات کی جان ہے، گویا تمام عقائد کا لب لباب ہے، اگر سب کچھ ہو اور اللہ کی وحدانیت ہی کا یقین نہ ہو تو پھر کسی چیز کی نہ کوئی حقیقت، نہ کوئی حیثیت، اسی کے تحت پھر اللہ کے رسولوں پر ایمان، اللہ کی کتابوں پر ایمان اور اللہ کے فرشتوں پر ایمان کا معاملہ ہے، اللہ پر ایمان کا مطلب ہی یہ ہے کہ اللہ نے جس رسول کو مبعوث کیا ہے اس پر پورا ایمان رکھا جائے، اس کے بغیر اللہ پر ایمان کیسے پورا ہوسکتا ہے، جب کہ وہی دنیا میں اللہ کا نمائندہ ہے، اس سے پہلے جتنے نبی ورسول گذرے ہیں، سب پر ایمان لایا جائے، لیکن سب سے اخیر میں جو ہستی اللہ کا پیغام لارہی ہے، اس کی تمام باتوں کو من وعن تسلیم کیا جائے، ورنہ کوئی اگر یہ کہے کہ رسول کے بغیر بھی میں اللہ پر ایمان رکھ سکتا ہوں، اور اللہ کو مان سکتا ہوں، تو اس کے دعوے کا یہی مطلب ہوا کہ اللہ نے فضول (نعوذ باللہ) رسول کو مبعوث کیا، اور جو احکامات اللہ نے اتارے وہ سب کے سب بے کار ہیں، ان کے بغیر بھی اللہ کی اطاعت وعبادت ممکن ہے، کوئی یہ کہے کہ میں فلاں رسول کو تسلیم کرتا ہوں، اور ان کے ذریعہ اللہ نے مجھے جو احکام دیے ہیں وہ میرے لیے کافی ہیں، لہٰذا مجھے کسی نئے نبی کی ضرورت نہیں، وہ بھی در پردہ اللہ پر الزام دھر رہا ہے کہ خواہ مخواہ فلاں کو مبعوث کرنے کی ضرورت کیا تھی، سابقہ فلاں نبی اور ان کی تعلیمات کافی تھیں، مجھے تو فلاں کے ذریعہ سے جو تیری ہدایات ملی ہیں وہ پسند ہیں، اور فلاں کے ذریعہ جو ہدایات ملی ہیں اس پر کوئی عمل کرنا چاہے تو کرے میں تو نہیں کرسکتا ہوں، ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر بتایئے کہ ایسے شخص کو اللہ کا مطیع وفرمانبردار کہا جائے گا یا باغی ومنکر؟ اسے کچھ بھی کہا جائے اللہ کا فرمانبردار کسی صورت میں نہیں کہا جاسکتا، الگ الگ انبیاء کی بات چھوڑیں، ایک ہی نبی کے ذریعہ اللہ کی طرف سے دو مختلف اوقات میں دو مختلف حکم آئیں تو پہلے حکم کو بنیاد بنا کر اگر کوئی بعد کے حکم کو رد کرتا ہے تو وہ بھی حد عبادت سے بلکہ حد دین سے نکل جاتا ہے، پہلے قبلہ بیت المقدس تھا، آپ ﷺ نے اللہ ہی کے حکم سے ہجرت کے بعد سولہ یا سترہ مہینے اس کی طرف رخ کر کے نمازیں پڑھیں پھر حکم نازل ہوا کہ رخ کعبۃ اللہ کی طرف کیا جائے، اب اگر کوئی یہ کہے کہ ہمیں تو پہلا حکم پسند ہے، دوسرے حکم پر ہم سے تو عمل نہیں ہوگا، بلکہ یہ حکم (خاکم بدہن) ہمیں کچھ غلط محسوس ہوتا ہے تو ایسا شخص کیا اللہ پر ایمان رکھنے والا قرار پائے گا؟ اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ ایمان باللہ کا لازمی جزء ایمان بالرسول ہے، اسی لیے اللہ کی آخری شریعت کے اترنے کے بعد اب رسول ﷺ پر مکمل ایمان کے بغیر اللہ پر ایمان کا تصور ہی نہیں ہوسکتا، اسی لیے قرآن نے بہت تاکید کے ساتھ اطاعت رسول کو اطاعت خدا کا واحد بنیادی ذریعہ قرار دیا؛

﴿مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ﴾ (جو رسول کی اطاعت کرتا ہے، اسی نے درحقیقت اللہ کی اطاعت کی)

ایک جگہ تو اللہ نے آپ ﷺ کا نام لے کر صراحت فرمائی تاکہ کسی کے ذہن میں کوئی غلط فہمی ہو تو وہ بھی ختم ہوجائے، ارشاد ہے؛ ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَآمَنُوا بِمَا نُزِّلَ عَلَىٰ مُحَمَّدٍ وَهُوَ الْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَأَصْلَحَ بَالَهُمْ﴾ (جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے کام کیے اور جو محمد ﷺ پر نازل شدہ کتاب پر ایمان لائے اور وہی حق ہے ان کے رب کی طرف سے تو اللہ ایسوں سے ان کے گناہوں کو جھاڑ دے گا اور ان کی حالت درست کردے گا)

ان مبارک آیات کے علاوہ قرآن میں متعدد مقامات پر "أطیعوا اللہ" کے ساتھ "أطیعوا الرسول" کا لفظ منصب رسالت کی اہمیت اور اتباع نبی کی ضرورت بیان کرنے کے لیے کافی ہے۔

ایمانیات کی دوسری بنیاد "ایمان بالآخرۃ" ہے، جس طرح ایمان باللہ تمام ایمانیات کی جان ہے، اسی طرح "ایمان بالآخرۃ" تمام اعمال کی جان ہے، یہ تصور جس قدر پختہ ہوگا کہ ایک دن دربار الٰہی میں حاضر ہوکر سب حساب دینا پڑے گا تو پھر ایسا شخص عملی کوتاہ نہیں بنے گا، بس اس مبارک آیت میں ان دو بنیادوں کو بیان کر کے عقائد واعمال کا سچا معیار پیش کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ جو بھی اس معیار پر پورا اترے گا، وہ چاہے جو بھی رہا ہو یا اس زمانے میں دین اسلام کا عنوان جو بھی رہا ہو وہی اصلی ہدایت یافتہ ہے، جس کے لیے اللہ کے پاس عظیم الشان اجر ہے اور اسے نہ خوف لاحق ہوگا نہ غم، باقی ناموں کے سہارے اللہ کی عدالت میں مقدمہ جیتنے کی خواہش ایک دلفریب خواب کے سوا کچھ نہیں، ارشاد ہے؛ "نہ تمہاری آرزوؤں کی کوئی حیثیت، نہ اہل کتاب کی تمناؤں کی کوئی حقیقت۔"

عُشر کے چند مسائل

مفتی راشد حسین ندوی

سونا چاندی، روپئے پیسے اموال تجارت اور جانوروں میں اسلام نے زکوۃ فرض کی ہے، اس کے کچھ احکام گزشتہ شماروں میں بیان کیے گئے ہیں، جہاں تک زمین کی پیداوار کا تعلق ہے تو اس میں بجائے زکوۃ کے عشر فرض قرار دیا گیا ہے، عشر کبھی پیداوار کا دسواں حصہ واجب ہوتا ہے، کبھی بیسواں حصہ، اس کا حکم خود قرآن مجید میں دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ الْأَرْضِ﴾ (البقرة: ۲۶۷) (اے ایمان والو! اپنی پاک کمائی میں سے اور ہم نے جو کچھ زمین سے تمہارے لیے نکالا ہے، اس میں سے خرچ کیا کرو)

دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ﴾ (الأنعام: ۱۴۱) (باغات اور کھیتوں کے ذکر کے بعد ہے) اور اس کی کٹائی کے وقت تم اس کا حق دو)

اکثر مفسرین کے نزدیک ان دونوں آیات میں عشر دینے کا حکم ہے، اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: جو زمین بارش، چشمے یا قدرتی طور سے سیراب ہوجائے، اس میں دسواں حصہ ہوگا اور جو (مصنوعی ذرائع) سے سینچی جائے، اس میں بیسواں حصہ ہوگا۔ (بخاری)

عشری اور خراجی زمینیں:

پھر زمینیں دو طرح کی ہوتی ہیں، عشری اور خراجی، عشری ان زمینوں کو کہتے ہیں جو مسلمانوں نے کافروں سے فتح کر کے حاصل کی ہوں، یا اسلامی حکومت میں کسی مسلمان کو بطور جاگیر عطا ہوئی ہو، یا مسلمان ملک میں کوئی زمین ویران پڑی ہو اور کسی مسلمان نے حکومت کی اجازت سے اسے قابل کاشت بنالیا ہو اور وہ زمین اس وقت سے اب تک مسلمانوں ہی کے قبضہ میں چلی آرہی ہو، تو یہ عشری زمین ہے جس میں دسواں یا بیسواں حصہ بطور عشر کے واجب ہوگا۔

اور خراجی زمین وہ ہے جو غیر مسلموں کے قبضہ میں چھوڑ دی گئی ہو، یا مسلمان کی زمین کو کسی کافر نے خرید لیا ہو، یا مسلم حکومت کی طرف سے کسی غیر مسلم کو بطور جاگیر دی گئی ہو، یا غیر مسلم حکومت نے اس زمین کو بحق سرکار ضبط کرلیا ہو تو یہ زمینیں خراجی ہیں، خواہ بعد میں ان کو کسی مسلمان نے خرید لیا ہو تب بھی وہ خراج ہی رہیں گی اور ان پر عشر کے بجائے خراج واجب ہوگا۔

(هندية: ۲/۵۹۰، كتاب السير، باب العشر والخراج، البحر الرائق: ۵/۱۷۶)

عشر کے اندر زکوۃ کی طرح عبادت کا پہلو غالب ہے، لہٰذا یہ صرف مسلمانوں پر واجب ہوتا ہے، جہاں تک خراج کا تعلق ہے تو اس کی حیثیت ٹیکس کی طرح ہے، لہٰذا یہ مسلم اور غیر مسلم دونوں پر عائد کیا جاتا ہے، پھر اس کی دو قسمیں ہوا کرتی تھیں:

۱- خراج موظف: یعنی پیداوار کا خیال کیے بغیر زمین پر رقبہ کے اعتبار سے ذمہ پر کوئی رقم وغیرہ متعین کردی جائے، مثلاً: ایک ایک زمین پر سالانہ پانچ سو روپئے یا کم وبیش زمین کی قوت پیداوار دیکھتے ہوئے مقرر کردیا جائے پھر خواہ پیداوار ہو یا نہ ہو، اتنی رقم زمین والے کو دینی ہوگی۔

۲- خراج مقاسمہ: یعنی پیداوار کے لحاظ سے چوتھائی یا دسواں بیسواں حصہ مقرر کردیا جائے۔

(فتاوی قاضی خاں علی ہامش الہندیہ: ۱/۲۷۱، شامی: ۲/۵۳)

ہندوستان کی زمینوں کا حکم:

ہندوستان کی زمینوں کے عشری یا خراجی ہونے کے بارے میں علماء کا بڑا اختلاف رہا ہے، فقہ اکیڈمی نے اپنی تجاویز میں اس سلسلہ میں بحث کرتے ہوئے اخیر میں لکھا ہے: ''عشر کے سلسلہ میں ان بنیادی اور متفقہ اصولوں اور ہندوستان کے موجودہ سیاسی نظام کو سامنے رکھ کر ہندوستان کی اراضی کی شرعی حیثیت کے متعلق سیمینار

اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ:

۱- ہندوستان میں مسلمانوں کی زرعی زمینوں کے متعلق یہ خیال کہ نہ ان میں عشر واجب ہے، نہ خراج' درست نہیں ہے۔

۲- ہندوستان کی زمینیں مندرجہ ذیل صورتوں میں بالاتفاق عشری ہیں:

الف: مسلمان حکومت کی طرف سے مسلمانوں کو عطا کردہ زمینیں جواب تک مسلمانوں کے پاس چلی آرہی ہیں۔

ب: جس علاقہ کے لوگ مسلم حکومت کے قیام سے پہلے بہ خوشی مسلمان ہوگئے ہوں اور ان کی زمینیں ابھی تک مسلمانوں کے پاس چلی آرہی ہیں۔

ج: جو زمینیں عرصہ دراز سے مسلمانوں کے پاس ہیں اور تاریخی طور پر ان کا خراجی ہونا ثابت نہیں ہے۔''

پھر کچھ اختلافات ذکر کرنے کے بعد اخیر میں ہے: ''تاہم اس پر اتفاق ہے کہ احتیاط تمام ہی زمینوں میں عشر ادا کرنے میں ہے۔''

(نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے: ۷۲-۷۳)

اوپر ہم نے جو آیات اور حدیث لکھی ہے، اس میں مطلقاً زمین کی پیداوار میں سے کچھ کو خرچ کرنے کا حکم ہے، خراجی اور عشری کی کوئی تقسیم نہیں ہے، اسی لیے مسلمانوں کو تمام زمینوں میں عشر نکالنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

عشر ہر پیداوار پر واجب ہے:

مفتی بہ قول کے مطابق عشر ہر طرح کی پیداوار پر واجب ہوتا ہے، جیسے گیہوں، چنا، گنا، سبزی وغیرہ، یہاں تک کہ اگر کسی نے اپنی زمین میں درجنوں کی کھیتی کر رکھی ہے، مثلاً: یوکلپٹس کے درخت لگا رکھے ہیں، یا بانس وغیرہ کی کھیتی کر رکھی ہے، تو اس میں بھی عشر واجب ہوگا، سال میں کئی بار فصل ہو تو ہر فصل میں سے الگ عشر نکالا جائے گا، باغات لگا رکھے ہیں تو پھلوں پر بھی عشر ہوگا، پھر پیداوار خواہ کم ہو یا زیادہ بہر صورت عشر واجب ہوگا۔ (ہندیہ: ۱/۱۸۶)

البتہ اگر بارش کے پانی سے یا قدرتی ذرائع سے سیراب کیا ہے تو کل پیداوار کا دسواں حصہ واجب ہوگا، لیکن اگر ٹیوب ویل یا کسی دوسرے مصنوعی ذریعہ سے سیراب کیا ہے تو کل پیداوار کا بیسواں حصہ واجب ہوگا۔ (شامی: ۲/۵۳-۵۵)

عشر نابالغ کی زمین پر بھی ہے:

عشر چونکہ زمین کی پیداوار پر ہوتا ہے، لہٰذا اس میں مالک کی اہلیت ہونا شرط نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ عشر نابالغ اور مجنون کی زمین پر بھی واجب ہے، موقوفہ زمین کسی کی ملکیت میں نہیں ہوتی لیکن اس کی پیداوار پر بھی عشر واجب ہے۔ (ہندیہ: ۱۸۵، بدائع: ۲/۱۷۳)

بٹائی اور کرایہ دی ہوئی زمین پر عشر:

جو زمین بٹائی پر دے رکھی ہو، اس کی پیداوار میں سے جتنا حصہ مالک کو ملے، اس کا عشر مالک کے ذمہ ہوگا، اور جتنا حصہ محنت کرنے والے کو ملے، اس کا عشر اس کے ذمہ ہوگا، بشرطیکہ وہ مسلمان ہوں۔

(بدائع: ۲/۱۷۴، شامی: ۲/۶۱)

اگر زمین کرایہ پر دی گئی اور کرایہ پر لینے والا اس میں کھیتی کرتا ہے تو عشر اسی پر ہوگا۔ (شامی: ۲/۶۰)

اور اگر زمین کسی مسلمان کو رعایت پر دے رکھی ہے اور وہ اس میں کھیتی کرتا ہے تو عشر ادا کرنا اسی کی ذمہ داری ہے، لیکن اگر کسی غیر مسلم کو عاریۃً زمین دے رکھی ہے، تو اس کا عشر مالک زمین کو ادا کرنا ہوگا، یعنی کل پیداوار کی قیمت لگا کر دسواں حصہ صدقہ کرے۔

(بدائع: ۲/۱۷۴، شامی: ۲/۶۰)

کھیتی کے اخراجات:

آج کل کھیتی میں بڑے مصارف آتے ہیں تو عشر کیا ان اخراجات کو منہا کرنے کے بعد بقیہ پیداوار کا نکالا جائے گا، یا کل پیداوار کا؟ اس پر قدیم و جدید تمام علماء متفق ہیں کہ عشر کل پیداوار کا نکالا جائے گا، کھاد پانی لگانے کی اجرت، دوا کے مصارف اور منڈی یا مل وغیرہ لے جانے کے مصارف کو منہا نہیں کیا جائے گا۔

(شامی: ۲/۵۶) (نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے: ۷۹)

عشر نکالنے سے پہلے پیداوار کا استعمال:

پیداوار کا عشر نکالنے کے بعد ہی غلہ وغیرہ استعمال کرنا چاہیے اور اگر پیداوار فروخت کردی ہے تو اولاً اس کا عشر نکالے پھر پیسے استعمال میں لائے۔ (شامی: ۲/۵۸)

عشر کے مصارف:

عشر کے مصارف وہی ہیں جو زکوۃ کے ہیں، یعنی مسلمان محتاج پر تملیکاً صرف کیا جائے، رفاہی کاموں میں استعمال نہ کیا جائے۔

(شامی: ۲/۶۴)

منصب نبوت اور معاش نبوی ﷺ

محمد ارمغان بدایونی ندوی

نبی اکرم ﷺ تقریباً پینتیس برس تک تجارتی مشاغل میں پوری تندہی کے ساتھ مصروف رہے، اور اپنی طبعی فطرت سلیمہ کے مطابق زندگی گذارتے رہے، لیکن مقصود حقیقی صرف یہ نہ تھا کہ مکہ کے آپسی تنازعات میں آپ ایک بہتر جج ثابت ہوں، یا میدان تجارت میں ایک بہتر رفیق ثابت ہوں، یا سماجی برائیوں سے دور رہ کر ایک شریف انسان ثابت ہوں، بلکہ آپ کی زندگی کا حقیقی مقصد دنیائے انسانیت کو ہدایت کا عالم گیر پیغام دینا تھا، اور ایک عالمگیر شریعت کی بنا ڈالنی تھی، اور توحید کی شمع فروزاں کرنا تھی، اور یہ عظیم ذمہ داری تمام دنیوی مشاغل سے بالاتر تھی، یہی وجہ ہے کہ بعثت کا زمانہ جتنا قریب ہوتا گیا، آپ ﷺ کی طبیعت دنیوی مشاغل سے اچاٹ ہونے لگی، اور آپ کی طبیعت مکہ کے جاہلی معاشرہ میں کڑھنے لگی، اسی لیے آپ ﷺ سماجی سے زندگی سے دور رہنے لگے، اور اپنی نشست و برخاست صرف اسی سوسائٹی تک محدود کرلی جو بت پرستی سے بیزار تھی، اور ایک حق مذہب کی متلاشی تھی، ان ایام میں آپ ﷺ پر عجیب کیفیات طاری رہتی تھیں، اور آپ ﷺ مدتوں غار حراء میں تمام مشاغل سے دور ہوکر یکسوئی کے ساتھ مراقبہ کیے رہتے تھے، اور واپسی میں طواف کعبہ کرنے کے بعد گھر تشریف لے جاتے تھے، تلاش حق کی اس متجسسانہ کیفیت میں آپ ﷺ نے بہت سے ایسے واقعات کا بھی مشاہدہ کیا، جو اس بات کا اشارہ دے رہے تھے کہ جلد ہی ہدایت کی صحیح راہ ملنے والی ہے۔ چنانچہ رمضان کے مہینہ میں جب آپ ﷺ غار حرا میں سکونت پذیر تھے، اچانک خدا تعالیٰ کا ایک فرشتہ حاضر خدمت ہوا اور اس نے سورۂ اقرأ کی ابتدائی آیات آپ کو یاد کرائیں۔ یہ واقعہ دراصل منصب رسالت کی تفویض تھا، جس کے پیش آنے پر آپ ﷺ شدید اضطرابی کیفیت کا شکار ہوگئے اور سیدھے گھر کی راہ لی، گھر پہنچ کر حضرت خدیجہؓ نے آپ ﷺ سے انتہائی تاریخ ساز تسلی بخش کلمات کہے۔ اور پھر رفتہ رفتہ آپ ﷺ دین برحق کی دعوت میں شب و روز مشغول ہوگئے، اور زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوگیا۔

بعثت سے قبل آنحضرت ﷺ کی روحانی جستجو اور بعثت کے بعد اشاعت حق کی راہ میں آپ کی غیر معمولی تڑپ، اس بات کی قطعاً اجازت نہیں دیتی تھی کہ آپ ﷺ تجارت سے ماضی کی طرح شغف رکھیں، اور پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے جب اپنا تمام مال و زر آپ کے حوالہ کردیا تھا، اس کے بعد یوں بھی اس کی ضرورت نہ تھی کہ آپ ﷺ محض حصول زر کی خاطر اپنی تگ و دو جاری رکھیں، تاہم بعض روایات کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ آپ ﷺ نے بعثت سے چند سال قبل اور بعثت کے بعد بھی محدود دائرہ میں تجارتی سلسلہ جاری رکھا۔

ابن کثیر کی روایت ہے کہ ابوسفیان بن حرب ایک مرتبہ شام کے تجارتی سفر پر گیا، اور وہاں سے واپس ہوکر یمن کا رخ کیا، پھر جب یمن سے واپسی ہوئی تو وہ تمام لوگ ابوسفیان سے ملاقات کے لیے آنا شروع ہوگئے جنہوں نے تجارت میں اپنا مال لگا رکھا تھا، تاکہ وہ اپنا منافع حاصل کرسکیں، انہیں وارد دین میں آنحضرت ﷺ بھی تھے، آپ ﷺ ابوسفیان کے گھر آئے اور دعا سلام کیا، سفر کے حال احوال دریافت کیے، اور واپس چلے گئے، آپ ﷺ کے اس طرز عمل پر ابوسفیان کو بڑی حیرت ہوئی، اور اس نے اپنی بیوی سے کہا: مجھے حیرت ہے کہ محمد بن عبداللہ نے اپنے سامان تجارت کا تذکرہ تک نہیں کیا، اور میری خیریت دریافت کرتے ہی چل دیا، جب کہ جتنے لوگوں کا حصہ میرے ساتھ لگا ہوا تھا، ان میں سے کسی نے میری خیریت تو معلوم نہ کی، مگر اپنا حصہ لینے کی فکر ضرور دامن گیر رہی، ہندہ نے جواب دیا: شاید تمہیں ابھی علم نہیں کہ انہیں اپنے رسول خدا ہونے کا دعوی ہوگیا ہے۔ اس کے بعد ابوسفیان خانہ کعبہ گیا، اور وہاں طواف کے دوران حضور ﷺ سے پھر ملاقات ہوئی، اس مرتبہ ابوسفیان نے گفتگو کی پہل کی اور کہا:

”ان بضاعتك قد بلغت كذا و كذا و كان فيها خير، فأرسل من يأخذها ولست آخذ منك فيها ما آخذ من قومي“ (تمہارے سامان تجارت میں خوب نفع ہوا ہے، تو کسی کو بھجوا کر اپنا سامان منگوالو، اور میں تم سے وہ فیصد بھی نہیں لوں گا جو میں

اپنی قوم سے لیتا ہوں)

آپ ﷺ نے اپنے مال تجارت کو ابوسفیان کی اس شرط پر لینا نامنظور فرمایا، تو ابوسفیان نے کہا: ٹھیک ہے جو میں اپنی قوم سے وصول کرتا ہوں، تم بھی اتنا ہی دے دینا، یہ سن کر آنحضرت ﷺ نے مال تجارت ابوسفیان کے گھر سے حاصل کیا۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ جس زمانہ میں راہِ حق کے متلاشی تھے، اس زمانہ میں اپنا مال تجارت قریش کے تجارتی قافلوں میں بطور مضاربت روانہ فرماتے تھے۔ آپ ﷺ کا یہ معمول بعثت کے بعد بھی یقیناً بدستور جاری رہا ہوگا، اس لیے کہ آپ ﷺ کے اہل مکہ سے آپسی معاملات تا وقت ہجرت جاری رہے تھے، جس کی بڑی دلیل ہجرت کے وقت کا وہ واقعہ ہے، جس میں ذکر ہے کہ اپنے پیچھے حضرت علیؓ کو اس لیے چھوڑا تھا تا کہ وہ اہل مکہ کی امانتیں ان تک پہنچادیں۔ تاہم اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جب آپ کی مخالفت نے زور پکڑا اور اہل مکہ کی ایذا رسانیاں اپنی حدیں پار کرنے لگیں تو آپ کی معیشت کو بھی زبردست نقصان پہنچا ہوگا اور بہت سے تجار نے آپ ﷺ کا مال تجارت لینے سے انکار بھی کردیا ہوگا۔

مکہ مکرمہ کے پرآشوب دور میں دو ایسی شخصیتیں (ابوطالب، خدیجہ) تھیں، جن کی وجہ سے آپ ﷺ کو معاشی اور سیاسی پشت پناہی حاصل تھی، اسی لیے جب ان دونوں کا انتقال ہوگیا اور کفار مکہ کے ظلم وستم کی انتہا ہوگئی تو آپ ﷺ کو ہجرت کا حکم ہوا اور آپ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔

مدنی زندگی میں جہاں آپ ﷺ کے دعوتی مشن کی راہیں ہموار ہوئیں، وہیں آپ ﷺ کے معاشی مسائل بھی حل ہوگئے اور مختلف ذرائع سے ضروریات زندگی پوری ہونے کا نظم بھی ہوگیا، مدنی عہد کی ابتداء میں ابن سعد کا بیان ہے کہ حضرات انصار باری باری کھانے پینے کا سامان پہنچانے کی سعادت حاصل کرتے، آپ ﷺ ان ہدایا کو بخوشی قبول فرماتے اور بقدر ضرورت استعمال کے بعد جو بچ جاتا اس کو فقراء صحابہ میں تقسیم فرمادیتے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ آپ ﷺ کے پڑوس میں رہنے والے انصار ہر روز آپ کے لیے اونٹنیوں کا دودھ اور دیگر کھانے پینے کی اشیاء لاتے تھے اور آپ ﷺ ازواج مطہرات کو عنایت فرمادیتے تھے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آپ ﷺ محض حضرات انصار کے تحائف وہدایا پر ہی قانع نہ رہے، بلکہ آپ ﷺ نے ذاتی طور پر ضروریات کی تکمیل کے لیے بکریاں بھی خریدیں، سنن ترمذی کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت عروہ بارقی کو بکری خریدنے کے واسطہ ایک دینار دیا، عروہ نے بازار میں جاکر ایک دینار سے دو بکریاں خریدیں، اور ان میں سے ایک بکری ایک دینار کی فروخت کردی، پھر ایک دینار اور ایک بکری کے ساتھ حضور ﷺ کے پاس حاضر ہوئے، حضور ﷺ نے ان کی اس زیرکی اور حسن تدبیر کو سراہا اور فرمایا:

"بارك الله لك فی صفقة يمينك" (اللہ تمہیں تمہارے ہاتھ کے سودے میں خوب برکت سے نوازے)

بلاذری کی ایک روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ بسا اوقات طلب معاش کے لیے مدینہ کے بازار بھی تشریف لے جاتے تھے، خواہ یہ ایک ہی دو مرتبہ کا اتفاق رہا ہو، ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نبی ﷺ کے گھر حاضر ہوئے، اور حضرت عائشہؓ سے حضور ﷺ کے متعلق معلوم کیا، حضرت عائشہؓ نے بتایا: گھر والوں کے لیے کچھ روزی تلاش کرنے نکلے ہیں، اس لیے کہ سات دن سے ہمارے گھر میں چولہا تک نہیں جلا ہے، حضرت عثمانؓ فوراً گھر واپس گئے اور کچھ کھانا اور ایک بکری ہدیہ میں بھیجی۔

اس کے بعد جب مدنی دور میں فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا تو مال غنیمت کا پانچواں حصہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کا قرار پایا، صحیح مسلم میں ہے: "ان الله تبارك و تعالىٰ رأى ضعفنا وعجزنا فطيبها لنا" اللہ تعالیٰ نے ہماری کمزوری اور بے بسی کو مدنظر رکھتے ہوئے، ہمارے لیے مال غنیمت کو حلال کردیا۔

اس کے علاوہ فدک اور خیبر وغیرہ کی آمدنی سے آپ ﷺ کی معاشی ضروریات کا مستقل حل ہوگیا تھا، اور مختلف بادشاہان مملکت بھی قیمتی ہدایا وتحائف بھیج کر شرف نیاز حاصل کرتے رہتے تھے، نیز مخیریق نامی یہودی کے بھی سات باغات آپ کی ملکیت میں آگئے تھے، جو اس نے اپنی وفات سے قبل آپ کو ہدیہ کیے تھے، گرچہ ان باغات کو آپ ﷺ نے وقف کردیا تھا۔

مسلمانوں کا زوال اور اس کے اسباب

محمد نفیس خاں ندوی

آٹھویں اور نویں صدی مسیحی کا زمانہ مسلمانوں کے عروج کا دور ہے، اس دوران روئے زمین کے ایک بڑے حصہ پر ان کے دین ومذہب، ان کی تہذیب وتمدن، ان کے علوم فنون اور ان کی شان وشوکت کا سکہ رواں تھا، یہ وہ مسلمان تھے جو دین ودنیا کی جامعیت کا کامل نمونہ تھے، ان کا خلیفہ متقی وپرہیزگار، صاحب تدبیر حاکم اور پختہ کار سیاسی قائد تھا، انھوں نے ایک ایسے معاشرہ کی بنا رکھی تھی جہاں نہ روحانیت ومادیت میں کوئی کشمکش تھی، نہ دین وسیاست میں کوئی تصادم، نہ اغراض واخلاق کے درمیان کوئی مزاحمت تھی اور نہ طبقوں اور گروہوں میں باہمی جنگ، ایک ایسا معاشرہ تھا جہاں اسلامی روح، تہذیب وتمدن کے پورے ڈھانچہ، حکومت کے پورے نظام اور اور لوگوں کی پوری زندگی میں جاری وساری تھی۔

لیکن جیسے جیسے دنیوی جاہ وجمال میں اضافہ ہوا، جذبات دینی اور حرارت ایمانی میں کمی آتی گئی اور خلفائے راشدین کے بعد دنیا کے منصب جلیل پر وہ لوگ حاوی ہوئے جنھوں نے اس کے لیے کوئی حقیقی تیاری نہیں کی تھی، ان کا دینی، روحانی اور اخلاقی معیار اتنا بلند نہ تھا جو ملت اسلامیہ کے رہنماؤں کے شایان شان ہوتا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کی آہنی دیوار میں کئی رخنے پیدا ہوگئے جن سے مسلسل فتنے اور مصائب نفوذ کرتے رہے۔

مستشرق ڈی آہسن (D'Ohsson) اپنے استشراقی اسلوب میں یوں تحریر کرتا ہے:

''اگر محمد (ﷺ) کے پیرو اپنے ہادی کی دکھائی ہوئی راہ پر چلتے، اور خلفائے راشدین کی مثال کی تقلید کرتے تو ان کی سلطنت رومی سلطنت سے وسیع تر اور محکم تر ہوتی۔''

The Spirit Of Islam By Ameer Ali, Syed, P.264

بالآخر اسلام کا یہ تناور درخت اندر سے کھوکھلا ہوتا چلا گیا، اِس اندرونی اضمحلال کے ظاہر ہونے میں کچھ مدت ضرور لگی، البتہ دسویں صدی کے دوران ہی یہ واضح ہوگیا کہ عرب مسلمان اپنے عالم پیری میں قدم رکھ چکے ہیں، اور پھر گیارہویں صدی کے دوران یہ انحطاط اپنی آخری حدوں کو چھونے لگا۔

اسباب زوال

مسلم اقتدار کے دورِ عروج کے تین مختلف مراحل ہیں؛ اقتدار کا حصول، اس کی بقا اور اس کی وسعت۔ اور یہ تینوں چیزیں بالترتیب ایمان کی طاقت، اخلاق کی بلندی اور وسائل کے استعمال سے مربوط ہیں، ایمان کی طاقت وہ نقطۂ آغاز ہے جس کے بغیر اخلاق اور وسائل بے اثر ہوجاتے ہیں، اور اسی ایمان کی کمزوری اور اس کے تقاضوں سے غفلت مسلمانوں کی پستی اور زوال کا بنیادی سبب ہے، اس کمزوری کے مختلف اسباب ہیں جن کا احاطہ درج ذیل اسباب میں کیا جاسکتا ہے:

(۱) فرقہ پرستی

نبی آخرالزماں (ﷺ) نے حجۃ الوداع کے موقع پر متنبہ کرتے ہوئے فرمایا تھا: "لاترجعوا بعدي كفارا يضرب بعضكم رقاب بعض" (میرے بعد کافر نہ ہوجانا کہ تم ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو)

نبی کریم (ﷺ) کا یہ انتباہ اس فرقہ پسندی کی جانب بھی ہے جس نے مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنادیا، خلافت اسلامیہ کی مضبوط دیواروں میں رخنہ پیدا کرکے اسے خانہ جنگی کی بھینٹ چڑھادیا، مملکت کے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے، خودمختار ریاستیں قائم ہوئیں، مسلم طاقتیں بکھر گئیں اور نتیجہ مسلمانوں کے زوال کی شکل میں ظاہر ہوا۔

اسلامی حکومتوں کو جن چیزوں نے بے تحاشہ نقصان پہنچایا ہے ان میں سے ایک اسلامی نظریہ اخوت سے انحراف بھی ہے، جو قبائلی، علاقائی اور نسلی خانہ جنگیوں پر منتج ہوا، اسلام نے اُن تمام بتوں کو پاش پاش کردیا تھا جن کی وجہ سے نسل انسانی کی وحدت معرض خطر میں پڑ جاتی ہے، نسلی تفاوت، رنگوں کا فرق، علاقائی امتیاز یا قبیلہ وخاندان کا

تفاخر' اسلام نے ان تمام امتیازات کو صرف تعارف اور پہچان کا ذریعہ مانا ہے' نہ کہ باعث نزاع یا باعث فخر ومباہات! اسلامی نقطۂ نظر سے وحدت انسانی اور اخوت باہمی کی بنیاد صرف ایمان ہے، ایک کلمہ گو دوسرے کلمہ گو کا بھائی ہے چناچہ مکہ کے ابوبکرؓ، فارس کے سلمانؓ، روم کے صہیبؓ اور حبشہ کے بلالؓ سب اسی اخوت اسلامی کی لڑی میں پروئے ہوئے تھے۔

جب تک اخوت اسلامی کا یہ نظریہ شعوری طور پر اور اپنی دریافت کے ساتھ زندہ رہا مسلم امت ''بنیان مرصوص'' کی طرح پختہ رہی، لیکن جب یہ نظریہ کمزور ہوا اور فرقہ پرستی کے عناصر اس میں در آئے تو یہ امت زوال کے راستہ پر گامزن ہوگئی، اس فرقہ پرستی کی وجہ سے مسلمانوں کو جتنا نقصان پہنچا اتنا نقصان یہودی سازش اور مسیحی وسائل سے بھی نہیں پہنچا، خلافت اسلامیہ میں پہلی دراڑ اسی فرقہ پرستی کا ہی شاخسانہ تھی، عہد عثمانی میں ملت اسلامیہ پر پہلا حملہ اسی راستہ سے کیا گیا، عبداللہ ابن سبا مسیحی رہا ہو یا یہودی ایجنٹ، وہ آیا تو ایک مسلمان اور محبّ اہل بیت کے روپ میں تھا، وہ اسلام کے مقابل کافر بن کر نہیں آیا تھا، اور اس دعویٰ کے ساتھ آیا تھا کہ خلافت اہل بیت کا حق ہے جس پر دوسرے قابض ہیں، یہ وہ فتنہ تھا جو حضرت عثمانؓ کی مظلومانہ شہادت پر منتج ہوا، خلافت اسلامیہ کی چولیں ہل گئیں، امت کی وحدت کو شدید دھچکا لگا، اور پھر امت گروہ در گروہ بٹتی چلی گئی۔

حضرت علی مرتضیٰؓ کے عہد میں خوارج نمودار ہوئے، یہ بظاہر اسلامیت کے علمبردار اور تقویٰ وتدین میں ہمالہ تھے، اپنے عقائد کی اشاعت میں جان کی بازی لگا دینا ان کے لیے کچھ مشکل نہ تھا، اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنا اپنا اولین فریضہ سمجھتے تھے، لیکن ان کے خود ساختہ عقیدوں اور غالیانہ تقشّف پسندی کے سبب اسلامی حکومت کو جتنا جانی ومالی نقصان اٹھانا پڑا اتنا کسی سیاسی گروہ کے ہاتھوں نہیں اٹھانا پڑا۔

بنوامیہ کے دور میں ایک طرف شیعہ، مرجئہ ومعتزلہ جیسے فرقوں کا ظہور ہوا تو دوسری طرف حکومت کے ایوانوں میں قبائلی تعصب کے اثرات نمایاں تھے، حکمرانوں نے ذاتی اغراض کے حصول میں تعصب کو خوب استعمال کیا، حاکموں کی تقرری میں یہی جذبہ کارفرما تھا، فاتح سندھ محمد بن قاسمؒ اسی تعصب کی بھینٹ چڑھے تھے، خلیفہ سلیمان کا حجاج کے رشتہ داروں کو سزائیں دینا، یزید ثانی کا آل مہلب کو ختم کرنا، ولید ثانی کا عبداللہ قسری کے ساتھ ظالمانہ سلوک کرنا یہ سب اسی قبائلی عصبیت کے شاخسانے ہیں۔

عباسیوں نے بنی امیہ کی بساط الٹ دی، پھر پورے خاندان کو موت کے گھاٹ اتار دیا، مُردوں کو قبروں سے نکال کر پامال کیا، بنو فاطمہ اور علویوں پر بے تحاشا مظالم ڈھائے، خلیفہ منصور نے محمد نفس الزکیہؒ اور ان کے بھائی ابراہیمؒ کے ساتھ سخت ناروا سلوک کیا، ہارون رشید کا رویہ بھی علویوں کے ساتھ کچھ اسی طرح کا تھا، ایک طرف عباسیوں کی قبائلی عصبیت نے ان کو کمزور کر دیا تو دوسری طرف قرامطہ اور باطنیہ نیمسلم حکومت کو کھوکھلا کر دیا۔

الغرض ابتدا ہی سے فرقہ پرستی کا مرض مسلمانوں میں پنپتا رہے اور حکومت اسلامیہ کی بے پناہ طاقت اسی میں ضائع ہوتی رہی، عوام اور حکومت کی وہ کوششیں جو اسلام کی اشاعت میں صرف ہونی چاہیے تھیں ان فرقہ پرستیوں کی نذر ہوگئیں، جس کا منطقی انجام سقوط بغداد اور سقوط غرناطہ کی شکل میں ظاہر ہوا۔

کسی بھی عہد کا مطالعہ کیا جائے تو مسلمانوں کو کھوکھلا کرنے والی چیز یہی فرقہ پرستی اور اس کے مظاہر ہیں، خاندانی عصبیت، قبائلی رقابتیں، علاقائی جھگڑے اور رنگ ونسل کے امتیازات' ملت اسلامیہ کو اس طرح کھا رہے ہیں جیسے لکڑی کو گھن کھا جاتی ہے، مشہور فرانسیسی مؤرخ ڈاکٹر گستاؤ لیبان کا تجزیہ بالکل درست ہے کہ یہی فرقہ پرستی مسلمانوں کے زوال کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئی:

''یہی خانہ جنگیاں ان کی نااتفاقیوں کا باعث ہوئیں اور پھر آپس کی نااتفاقیوں نے ان کے تنزل کی بنا ڈالی، فی الواقع عربوں کی قوت قبل اس کے کہ اس پر دشمنوں کا اثر پڑے خود ان کے اپنے ہاتھوں ضائع اور برباد ہوگئی تھی۔''

{La civilisation des Arabes : livres I et II. 130

ذلت وادبار کے اس دور میں بھی ملت اسلامیہ کی کوششوں کا ننانوے فیصد اسی فرقہ پرستی کی نذر ہو رہا ہے، اسلام کے نام پر کی جانے والی کوششوں کا حقیقی محور مخصوص فرقہ کی نشر واشاعت سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔ اس چیز نے مسلمانوں کو بام عروج سے قعر مذلت میں دھکیل دیا تھا اور آج بھی اس دلدل سے نہ نکلنے سکنے کی ایک بنیادی وجہ یہی فرقہ پرستی ہے۔

عمل منقطع ثواب غیر منقطع

مولانا عبد الماجد دریابادیؒ

عن أبی هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ان مما يلحق المؤمن من حسناته بعد موته؛ علما نشره أو ولدا صالحا تركه أو مصحفا ورثه أو مسجدا بناه أو بيتا لإبن السبيل بناه أو نهرا أجراه.

’’حضرت ابو ہریرہؓ صحابی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ان نیکیوں میں جو مومن کو اس کی موت کے بعد پہنچتی رہتی ہیں وہ علم (دین) جس کو شائع کیا ہو یا فرزند صالح جس کو وہ چھوڑ کر مرا ہو یا قرآن مجید جس کو ترکہ میں چھوڑا ہو، یا مسجد جسے بنایا ہو یا مسافر خانہ جسے بنایا ہے یا نہر جس کو جاری کیا ہو۔‘‘

اور دیکھیے کہ اس اجر بعد انقطاع حیات ہی کے میدان میں کتنی وسعت وگنجائش ہے۔

(۱) کوئی بھی دینی مسئلہ جسے وہ مومن پھیلا گیا۔ (۲) اولاد صالح۔ (۳) قرآن مجید جسے بطور وراثت چھوڑ گیا۔ (۴) کوئی مسجد جو بنوا گیا۔ (۵) کوئی مسافر خانہ یا مہمان سرائے جسے وہ تعمیر کر گیا۔ (۶) کوئی نہر جسے وہ جاری کرا گیا۔

افراد ملت میں کم تر ہی ایسے ہوں گے جنہیں خوش نصیبی کے ان چھ عنوانوں میں سے کسی کے نیچے جگہ نہ ملے۔

سلسلے کی حدیثوں اور آثار صحابہؓ سے جو کچھ اب تک گزرا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ فلاں فلاں خوش خبریاں موعود ہیں، میت مومن کے افعال اختیاری تشریعی پر۔ مثلاً ایمان پر اور اعمال صالحہ پر۔ اور فلاں فلاں موعود ہیں، بعض حالات تکوینی وغیرہ اختیاری پر۔ مثلاً؛ پردیس کی موت، جمعہ کی موت پر وغیرہا۔ لیکن بقول حضرت تھانوی علیہ الرحمہ، اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل ولطف خصوصی سے اور طریقے ان طریقوں کے علاوہ بھی تجویز فرما دیے۔ اب کچھ بشارتیں اس سلسلہ کی سن لیجیے۔

’’حضرت ابو ہریرہؓ صحابی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب انسان مر جاتا ہے تو اس کا عمل سب موقوف ومنقطع ہو جاتا ہے، مگر صرف تین صورتیں باقی رہ جاتی ہیں، ایک تو یہ صدقہ جاریہ، دوسرا علم نافع، تیسرے اولاد سعید جو اس کے حق میں دعائے خیر کرتی ہے۔‘‘

صدقہ جاریہ کی مثالیں مسجدیں، عبادت خانے اور نفع عامہ کے کام، جیسے؛ مہمان سرائیں، سڑکیں، کنوئیں، تالاب وغیرہ ہیں۔ اور علم نافع کی صورت تصنیف وتالیف کی ہے اور دعائے خیر کرنے والی اولاد کی مثال بالکل ظاہر ہے۔

’’حضرت جریر بن عبد اللہ سے ارشاد نبوی ﷺ مروی ہے کہ جو شخص کوئی نیک طریقہ جاری کرے، اس کو بھی اس نیک طریقہ کا ثواب ملے گا اور لوگوں کو بھی ملے گا، جو اس کے بعد اس پر عمل کریں بغیر اس کے کہ ان لوگوں کے اجر میں سے کچھ بھی کم کیا جائے۔‘‘

اور ایسے خوش نصیب کی ایک بہترین مثال معاصر حضرات میں خود حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ملتی ہے۔ اپنی کتابوں، اپنے وعظوں سے کتنی بڑی تعداد میں ان لوگوں کو دین کی راہیں دکھا گئے، فلاح وطاعت کے راستے سجھا گئے اور زندگیاں درست کر گئے اور اپنی ذاتی طاعت وعبادت کے علاوہ بے شمار اجر اس بالواسطہ طریقہ سے اپنے لیے ثبت کر گئے۔

R.N.I. No.
UPURD/2009/28748

Monthly
Payam-e-Arafat
Raebareli

Postal Reg. No.
RBL/NP -19

Volume: 11 ✦ JULY 2019 ✦ Issue: 07

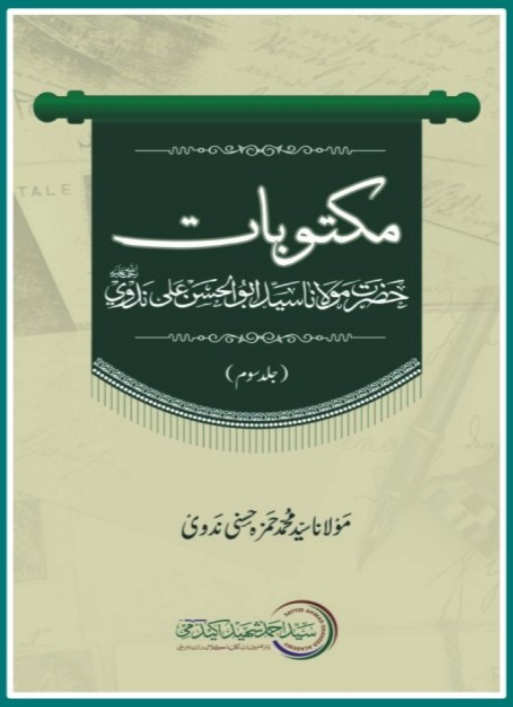

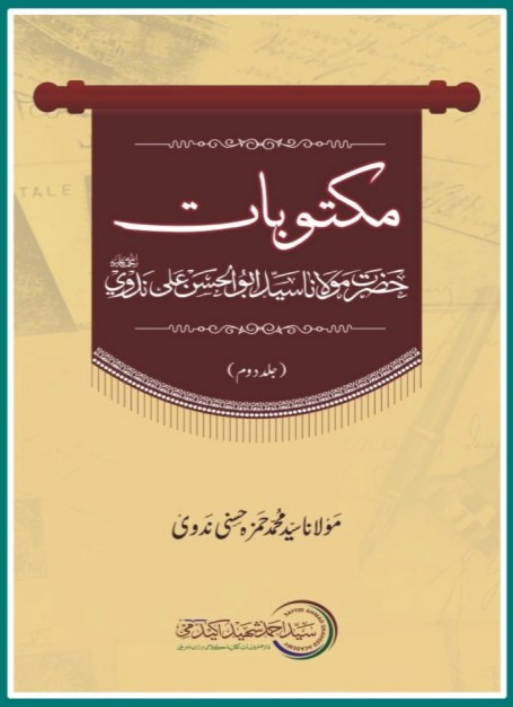

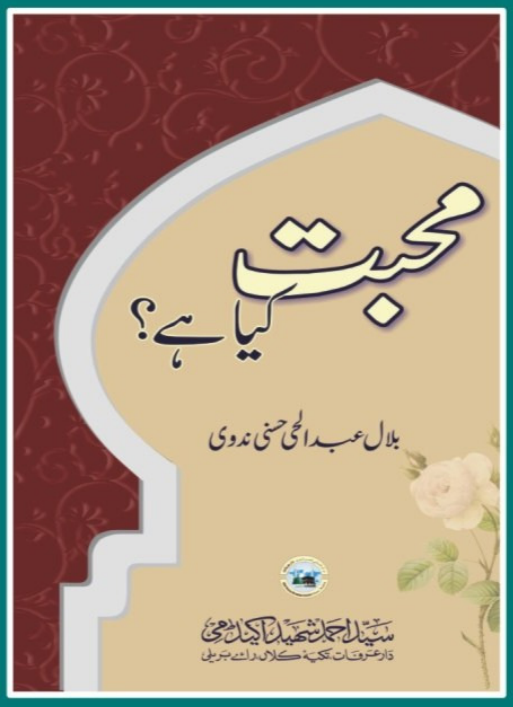

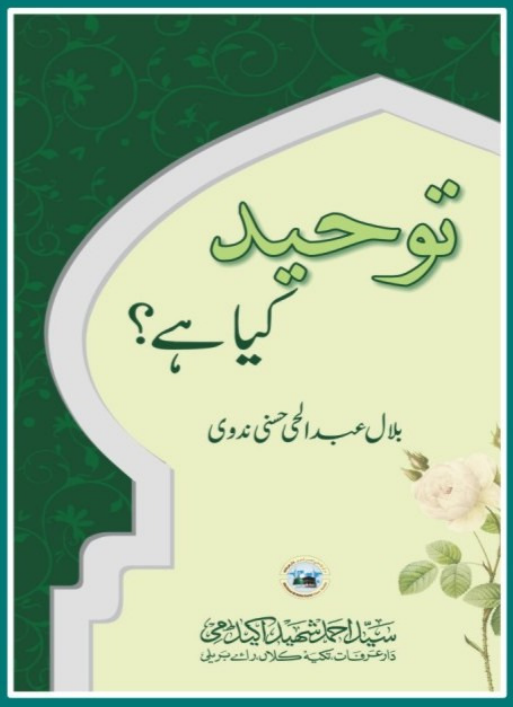

Editor: Bilal Abdul Hai Hasani Nadwi
MARKAZUL IMAM ABIL HASAN AL-NADWI
E-Mail: markazulimam@gmail.com - Dare Arafat, Takiya Kalan, Raebareli (U.P.) 229001 - Mobile: 9565271812
Printed & Published by: Mohammad Hasan Nadwi, On Behalf of Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi.
Printed at S.A. Offset Printers, masjid ke Peeche, Phatak Abdullah Khan, Sabzi Mandi, Station Road, Raebareli (U.P.)